ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا سہ ماہی ترجمان

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جنوری ــــــــــــ مارچ ۲۰۰۰ء

ــ: ایڈیٹر :ــ

سیّد جلال الدّین عمری

پان والی کوٹھی دودھپور علی گڑھ

۲۰۲۰۰۱

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ

جلد ۱۹ شمارہ ۱

جنوری ——— مارچ ۲۰۰۰ء

رمضان ——— ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ

زرتعاون

اندرون ملک ———	فی شمارہ		۲۰ روپیے
———	سالانہ		۷۵ روپیے
———	لائبریری وادارے سالانہ		۱۰۰ روپیے
بیرون ملک ———	(انفرادی)	"	۲۵۰ روپیے
———	(ادارے)	"	۵۰۰ روپیے
پاکستان ———	(انفرادی)	"	۱۵۰ روپیے
———	(ادارے)	"	۲۰۰ روپیے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے لیے نازیر پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپواکر ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرفِ آغاز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کے بعض اہم واقعات	سید جلال الدین عمری	۵

تحقیق وتنقید

اسرار الفاتحہ - ایک تعارف	پروفیسر کبیر احمد جائسی	۳۵
انگریزی عہد میں اسلامی تہذیب	ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی	۶۶

بحث ونظر

نصابِ زکوٰۃ کی تعیین (چند اصولی مباحث)	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۸۸

ترجمہ وتلخیص

احادیث اور اقوالِ ائمہ میں تعارض کے اسباب	علامہ ابن تیمیہؒ مترجم: مولانا الطاف احمد الاعظمی	۹۸

خبرنامہ

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی	محمد رضی الاسلام ندوی	۱۱۹

اس شمارہ کے لکھنے والے

۱۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی

سابق ڈائرکٹر ادارۂ علوم اسلامیہ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۔ ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

ناظم دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

پروفیسر ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۴۔ مولانا الطاف احمد مالانی عمری

جامعہ اسلامیہ۔ مدینہ منورہ۔ سعودی عرب

۵۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

رکن ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

۶۔ سید جلال الدین عمری

سکریٹری ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ

خوش نویس:۔

ابن سیف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کے بعض اہم واقعات[1]

سید جلال الدین عمری

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب علی الاعلان دعوت کا حکم دیا گیا تو آپ نے اہلِ خاندان کو بھی اسلام کی دعوت دی اور دوسرے قبائل کے درمیان بھی کھل کر اسلام کو پیش فرمایا۔ اس سے ماحول میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی اور ہر طرف سے مخالفت شروع ہو گئی۔ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے آپ کی دعوت کے بنیادی نکات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

آپ نے جس وقت دعوت کا آغاز فرمایا مکہ کا پورا معاشرہ شرک و بت پرستی میں مبتلا تھا۔ قرآن مجید نے اس پر زبردست تنقید کی کہ اس کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے۔ یہ عقلِ سلیم اور صحیح فطرت کے خلاف ہے۔ یہ بے جان بت تمہارے کچھ کام نہیں آسکتے۔ ان میں نفع و ضرر کی کوئی طاقت نہیں ہے۔ موت و حیات، مرض و صحت اور فقر و غنا ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہ تمہاری ضرورتوں کی تکمیل سے قاصر ہیں۔ یہ بولتے نہیں، دیکھتے اور سنتے نہیں، خود سے حرکت نہیں کر سکتے اور کسی چیز کو پکڑ نہیں سکتے۔ ان سے جو فریاد کی جاتی ہے وہ فضا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔

قرآن مجید نے شرک اور بت پرستی کے مقابلے میں توحیدِ خالص کو پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی ذات و صفات کا صاف ستھرا تصوّر دیا اور واضح کیا کہ اس کائنات

---

[1] مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی حکمت عملی، کے عنوان سے سہ ماہی تحقیقات اسلامی میں دو قسطیں شائع ہو چکی ہیں ملاحظہ ہو۔ اپریل۔جون ۹۸ء اور جولائی۔ستمبر ۹۸ء۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے (جلال الدین)

کا ایک ہی خالق و مالک اور فرماں روا ہے۔

اس نے انسان کو حیثیت واضح کی کہ وہ اللہ کا بندہ ہے وہی اس کا معبودِ حقیقی ہے۔ صرف اسی کی عبادت اس کے لیے روا ہے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کا کوئی جواز نہیں ہے۔ انسان کو اللہ کی اطاعت اور عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ یہاں من مانی اور بے قید زندگی نہیں گزار سکتا۔ بلکہ اسے اللہ کی ہدایت کا پابند ہونا چاہیے اسی میں اس کی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر دور میں اپنے رسولوں کے ذریعہ انسان کی ہدایت کا انتظام کرتا رہا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور اسی کی ہدایت پیش کر رہے ہیں۔ آپ کی رسالت کا انکار اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا انکار ہے۔ آخرت کا آنا برحق ہے جہاں انسان اپنے اعمال کی جزا و سزا پائے گا۔ نیکوکار جنت کے مستحق قرار پائیں گے اور بدکاروں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

اس نے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی۔ اخوت و محبت، عدل و انصاف، راست بازی، عفت و عصمت، دیانت و امانت اور ایفائے عہد جیسی صفات کی ترغیب دی اور انھیں اختیار کرنے کا حکم دیا، ظلم و زیادتی، حق تلفی، کذب و افترا، زنا اور بدکاری، خیانت اور بدعہدی اور مکر و فریب جیسے رذائلِ اخلاق سے دور رہنے اور اجتناب کرنے کی ہدایت کی۔

اس نے کہا کہ خدا، رسول اور آخرت کا انکار انسان کو بے لگام بنا دیتا ہے۔ وہ جواب دہی کے احساس سے خالی ہو کر کسی بھی وادی میں بھٹک سکتا ہے۔ خدا بیزار اور آخرت فراموش انسان بلندیٔ کردار سے محروم اور اخلاق کی پستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی خواہش اور اپنے مفاد کی تکمیل کے لیے جو کچھ بھی کر گزرے کم ہے۔ اس کے بعد ظلم و زیادتی اور فتنہ و فساد کی آگ سے سوسائٹی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس دنیا میں امن و امان، عدل و انصاف، صرف خدا پر ایمان، آخرت کے خوف اور رسول کی اتباع ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جن قوموں نے اس کی پابندی اختیار کی وہ ہمیشہ کامیاب رہیں اور جنھوں نے مخالفت کی راہ اپنائی وہ صفحۂ زمین سے مٹا دی گئیں۔

اس نے پوری قوم سے اور خاص طور پر سردارانِ قریش سے کہا کہ وہ دینِ حق

کی مخالفت نہ کریں اور اپنی غلط روش سے باز آجائیں ورنہ وہ بھی تباہ ہو جائیں گے۔

قرآن مجید کی یہ تعلیمات اور تنبیہات روزِ اول سے اسلوب بدل بدل کر وضاحت کے ساتھ مسلسل نازل ہو رہی تھی اور دعوتِ عام کی وجہ سے وہ مخاطبین کی بڑی تعداد تک پہنچنے لگیں۔ ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔ اس کے نتیجہ میں ایک طرف مختلف قبائل سے افراد ٹوٹ ٹوٹ کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے شروع ہو گئے، دوسری طرف اس کا پورے ماحول پر ردِ عمل ہوا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہونے لگی اور وہ وقت کے ساتھ شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جو ردِ عمل ہوا اس کے بارے میں امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام کی دعوت کھلے اور چھپے ہر طریقے سے دے رہے تھے اور آپ پر ایمان لانے والے ایمان لا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر نوجوان اور کمزور افراد تھے۔ آپ کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود کفارِ قریش نے آپ کی مخالفت نہیں کی البتہ جب کبھی ان کی مجلسوں سے آپ کا گزر ہوتا تو اس طرح کے فقرے کس دیا کرتے تھے کہ عبدالمطلب کے گھر کا یہ لڑکا آسمان سے بولتا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کے خداؤں کی، جن کی وہ اسے چھوڑ کر عبادت کر رہے تھے، نکتہ چینی کی اور کہا کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے اور ان کے آباء و اجداد کے متعلق، جن کا حالتِ کفر میں انتقال ہوا، فرمایا، وہ آخرت میں تباہ ہوں گے، تو ان کی طرف سے بغض و عداوت کا اظہار ہونے لگا اور وہ آپ کے دشمن بن گئے [۱]

یہ بات ابنِ اسحاق نے بھی کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۱۹۹، طبع بیروت ، زرقانی شرح المواہب اللدنیہ: ۱/۲۶۲ م دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء السیرۃ الحلبیۃ (انسان العیون فی سیرۃ الامین والمامون): ۱/۴۶۱م۔ دار المعرفۃ بیروت۔ شیخ حسین دیار بکری۔ الخمیس فی احوال انفس نفیس : ۱/۳۲۵۔

کے کھل کر اسلام کو پیش کرنے اور دعوت دینے کی وجہ سے، میری معلومات کی حد تک آپ کی قوم نے آپ سے دوری اختیار نہیں کی لیکن جب آپ نے ان کے معبودوں کا ذکر کیا اور ان پر نکتہ چینی کی تو اسے انھوں نے بڑی بات سمجھا اور محاذ آرائی شروع کر دی اور سوائے ان چند افراد کے جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت سے نوازا تھا اور جو تعداد میں تھوڑے تھے اور اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھے، سب آپ کی مخالفت اور دشمنی میں ایک ہو گئے۔[۱]

مشہور صحابی اور دورِ اوّل کے مورّخ عروہ بن زبیرؓ، عبدالملک بن مروان کو لکھتے ہیں:

فإنه لما دعا قومه لما	جب آپ نے اپنی قوم کو اس دین
بعثه الله من الهدى	کی دعوت دی جس کے لیے اللہ نے
والنور الذي انزل معه لم	آپ کو مبعوث فرمایا، جس میں ہدایت
يبعدوا منه اول ما دعاهم	اور وہ نور ہے جو آپ پر نازل ہوا تو
وكادوا يسمعون له حتى	انھوں نے آپ کی دعوت کے آغاز
ذكر طواغيتهم[۲]	میں آپ سے دوری نہیں اختیار کی لیکن
	جب آپ نے ان کے طواغیت کا ذکر
	کیا تو وہ دور ہو گئے۔

غالباً اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ حرام میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کچھ لوگ بتوں کو سجدہ کر رہے ہیں آپ نے انھیں اس سے منع کیا اور کہا کہ تم لوگوں نے تو اپنے باپ ابراہیمؑ کے مذہب کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کا ان لوگوں نے وہی جواب دیا جو دنیا کی ہر مشرک قوم دیتی ہے کہ ہم تو محض اس لیے ان کی عبادت کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں۔ آپ نے ان کے اس خیال پر تنقید کی اور اسے غلط اور باطل ٹھہرایا۔[۳]

---

[۱] ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ: ۳۰۱/۱۔ طبع جدید بیروت ۱۹۹۴ء

[۲] طبری، تاریخ الامم والملوک: ۵۴۶/۱۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۷ء

[۳] زرقانی، شرح المواہب اللدنیہ: ۴۶۲/۱۔ السیرۃ الحلبیۃ: ۴۶۱/۱

اسی قسم کی تنقیدیں تھیں جو آپ کی مخالفت کا سبب بن گئیں۔ ۴ بعثت میں دعوتِ عام کا آغاز ہوا، بعض مورخین کا خیال ہے ۵ بعثت میں آپ کی مخالفت میں شدت آگئی۔[۱]

ان نازک حالات میں اللہ تعالیٰ نے خاص نصرت فرمائی اور ابوطالب کو آپ کی حمایت میں کھڑا کر دیا۔ ابوطالب بنو ہاشم کے سردار تھے۔ ان کے ساتھ پوری جمعیت تھی اور قریش کے سبھی قبائل میں ان کی شخصیت کا احترام پایا جاتا تھا اس وجہ سے گو کہ آپ کی اور آپ کی دعوت کی ہر طرف سے مخالفت ہو رہی تھی لیکن کسی کو آپ کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کی حمایت سے فائدہ اٹھایا اور کسی مخالفت کی پروا کیے بغیر خدا کے دین کو کھلم کھلا پیش کرنے اور اس کی دعوت دینے میں لگ گئے۔ ابن ہشام نے لکھا ہے:۔

وحدب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمّہ أبوطالب، ومنعه وقام دونه۔ ومضیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی أمر اللہ، مظھراً لأمرہ لا یردّہ عنه شیئ[۲]	(اس موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کے چچا ابوطالب مہربان ہو گئے اور آپ کی حفاظت کی اور آپ کی تائید میں کھڑے ہو گئے (اس کے نتیجہ میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے (تبلیغِ دین) کے حکم کو اظہار و اعلان کے ساتھ جاری رکھا۔ کوئی چیز آپ کو اس سے روکتی نہیں تھی۔

علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:۔

فلما دعا قومه إلی دین اللہ نابذوہ فأجارہ عمّه	جب آپ نے اپنی قوم کو اللہ کے دین کی دعوت دی تو وہ دشمنی پر اتر

---

[۱] زرقانی، شرح المواہب اللدنیہ: ۱/۲۶۲م

[۲] سیرۃ ابن ہشام: ۱/۳۰۱

ابوطالب ومنع منه قريشاً لأنهم أرادوا قتله لما دعاهم إليه من ترك ما كانوا عليه هم وآباؤهم ومفارقته لهم في دينه وتسفيه أحلامهم في عبادة أصنام لا تبصر ولا تسمع ولا تضرّ ولا تنفع ؎۱

آئے اور آپ سے الگ ہو گئے۔ اس وقت آپ کے چچا ابوطالب نے آپ کو پناہ دی اور قریش کو آپ پر دست درازی سے روک دیا۔ کیونکہ وہ آپ کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ آپ ان کو اس بات کی دعوت دے رہے تھے کہ وہ اور ان کے باپ دادا جس طریقہ پر ہیں اسے ترک کردیں اور آپ نے اپنے دین کے معاملہ میں ان سے علٰحدگی اختیار کر لی تھی اور انھیں بے وقوف اور نادان بتا رہے تھے کہ وہ بتوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ دیکھتے اور سنتے ہیں۔ جو نہ نقصان پہونچاتے اور نہ نفع پہنچاتے ہیں۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے آپ کی تبلیغی مساعی میں روز بہ روز اضافہ ہونے لگا، شرک، اس کے فلسفے اور مشرکین کے طرزِ حیات پر آپ کی تنقید میں شدت آتی چلی گئی اور مشرکین کو صاف محسوس ہونے لگا کہ اپنے عقائد و نظریات کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نرم رویّہ یا مصالحت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ان کے بڑے بڑے سردار ابوطالب کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کا یہ بھتیجا ہمارے معبودوں پر تنقید کرتا ہے، ہمارے دین میں نقص نکالتا ہے، ہمیں ناسمجھ اور بے وقوف بناتا ہے، ہمارے باپ دادا کو گمراہ قرار دیتا ہے، اب آپ اس کو ان حرکتوں سے باز رکھیے یا ہمارے اور اس کے معاملے میں دخل نہ دیجئے ہم اس سے نمٹ لیں گے۔ ہمارا مطالبہ ناروا نہیں ہے۔ آپ کا دین بھی وہی ہے جو ہمارا دین ہے اور آپ بھی ہماری طرح اس کے طریقے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ حضرت ابوطالب نے ان کے غصّے کو ٹھنڈا کیا

؎۱ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (مقدمہ) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ۱/۱۴۱ دارالکتب العلمیہ لبنان ۱۹۹۵ء

اور سمجھا بجھا کر انھیں واپس کیا۔ اس واقعہ کو بیان کر کے ابن اسحاق کہتے ہیں : ۔

ومضی رسول اللہ صلی	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کام
اللہ علیہ وسلم علی ماھو	جاری رکھا، اللہ کے دین کو واضح کرتے
علیہ، یظھر دین اللہ، و	اور اس کی طرف دعوت دیتے رہے۔
یدعو الیہ، ثم شری	پھر آپ کے اور مخالفین کا معاملہ سخت ہوگیا۔
الأمر بینہ وبینھم حتی	یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے سے
تباعد الرجال وتضاغنوا	دور ہوگئے اور دشمنی ظاہر ہونے لگی۔ قریش
وأکثرت قریش ذکر رسول اللہ	نے کثرت سے آپ کا تذکرہ شروع کردیا۔
صلی اللہ علیہ وسلم بینھا فتذامروا فیہ	آپ کی مخالفت اور دشمنی پر ایک دوسرے
وحض بعضھم بعضا علیہ[1]	کو ورغلانے لگے۔

اس کے بعد سردارانِ قریش دوبارہ ابوطالب کے پاس پہنچے کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں، ہم سب کے درمیان آپ کو قدر ومنزلت کا مقام حاصل ہے۔ ہم نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اپنے برادرزادہ کو اپنی تبلیغ سے باز رکھیں لیکن آپ نے انھیں باز نہیں رکھا۔ خدا کی قسم ہم اس بات کو برداشت نہیں کرسکتے کہ ہمارے باپ دادا کو ہدف ملامت بنایا جائے، ہمیں بے وقوف ٹھہرایا جائے اور ہمارے معبودوں پر نکتہ چینی کی جائے۔ اب آپ انھیں ان باتوں سے روک دیں یا ہمارے اور آپ کے درمیان تلوار سے فیصلہ ہوجائے۔ اس دھمکی کا ابوطالب پر اثر ہوا اور وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئے۔ ان کے لیے یہ بھی مشکل تھا کہ اپنی قوم کو چھوڑ دیں اور اس سے دشمنی مول لیں اور اس کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ آپ کی حمایت سے دست کش ہو جائیں اور آپ کو مخالفین کے حوالہ کردیں۔ ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صورت حال کی نزاکت سمجھانی چاہی۔ چنانچہ ان لوگوں کے جانے کے بعد آپ کو بلا کر اس گفتگو کی پوری تفصیل

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۰۲۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۴۷۳۔ مطبع: دار المعرفۃ بیروت، ۱۹۸۳ء

سنائی اور کہا، بیٹے تم مجھ پر بھی رحم کھاؤ اور اپنے اوپر بھی۔ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں نہ اٹھا سکوں۔

اس گفتگو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ ابوطالب آپ کی نصرت وحمایت سے گھبرا رہے ہیں اور آپ کو چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ دنیوی لحاظ سے جو سب سے بڑا سہارا تھا وہ ٹوٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ آپ اس سے بالکل ہراساں نہیں ہوئے اور زبانِ مبارک سے عزم وہمت کے وہ الفاظ نکلے جو اولوالعزم پیغمبروں ہی کی زبان سے نکل سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا چچا جان: خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لاکر رکھ دیں تب بھی اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یا اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب کرے گا یا میں اسی کوشش میں ختم ہو جاؤں گا۔

یہ الفاظ ادا کر کے آپ آب دیدہ ہو گئے اور اٹھ کر جانے لگے تو ابوطالب نے آواز دی۔ بھتیجے ادھر آؤ۔ قریب آنے تو کہا تم جو کچھ تبلیغ کرنا چاہتے ہو کرو۔ خدا کی قسم میں تمہیں کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔[1]

اس واقعہ کے بعد قریش کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ابوطالب اپنی قوم کو چھوڑ سکتے ہیں اور اس کی دشمنی گوارا کر سکتے ہیں لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت سے دست کش نہیں ہو سکتے اور آپ کو کسی کے حوالے نہیں کر سکتے۔ پھر انھوں نے ابوطالب کو ایک اور رخ سے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ عمارہ بن ولید کو ان کی خدمت میں لے گئے اور کہا یہ قریش کا بہت ہی مضبوط اور خوبصورت نوجوان ہے۔ آپ اسے اپنی اولاد بنا لیجئے۔ یہ آپ کی نصرت وحمایت کرے گا اور کسی نے اسے ختم کر دیا تو آپ اس کی دیت کے مالک ہوں گے۔ اس کے عوض میں آپ اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ہم اسے ختم کر دیں، جس نے آپ کے اور آپ کے بزرگوں کے دین کی مخالفت شروع کر رکھی ہے، آپ کی قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے اور باپ دادا کو ناسمجھ اور بے وقوف کہہ رہا ہے۔ یہ ہمارا آپ سے کوئی ناجائز مطالبہ نہیں ہے بلکہ ایک فرد کے عوض دوسرے

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۳۰۲/۱ ۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۴۷۵/۱

فرد کو حوالہ کرنے کی درخواست ہے۔

حضرت ابوطالب نے یہ سن کر کہا خدا کی قسم یہ بہت بری پیش کش ہے۔ تم اپنی اولاد اس لیے میرے حوالے کرو گے کہ میں اسے پالوں پوسوں اور اس کی پرورش کروں اور میں اپنا بچہ اس لیے تمہارے حوالے کروں تاکہ تم اسے قتل کر دو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس پر مطعم بن عدی نے کہا کہ تمہاری قوم نے انصاف کی بات کہی ہے اور جس مصیبت سے تم خود بھی پریشان ہو اس سے نجات پانے کی یہ ایک اچھی صورت ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنی قوم کی کوئی بات ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہو۔ ابوطالب نے جواب دیا یہ انصاف ہرگز نہیں ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ تم نے بھی میرا ساتھ نہ دینے اور اپنی قوم کی حمایت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے لہٰذا جو تمہارا جی چاہے کرو[1]

اس پورے عرصے میں اسلام کی دعوت آہستہ آہستہ عام ہو رہی تھی اور بعض بڑی شخصیتیں اسلام کی نعمت سے سرفراز ہو رہی تھیں۔ ان میں حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ بہت نمایاں ہیں۔

حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کی پہاڑی کے پاس تھے۔ ابوجہل کا اُدھر سے گزر ہوا تو وہ آپ کے ساتھ بدزبانی اور آپ کی شان میں گستاخی کرنے لگا اور آپ کے اور اسلام کے بارے میں سخت ناگوار باتیں کہنی شروع کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل خاموش رہے اور اس کے منہ نہیں لگے۔

عبداللہ بن جدعان کی ایک لونڈی یہ سب کچھ اپنے گھر سے دیکھ رہی تھی اس بدتمیزی کے بعد ابوجہل کعبہ کے پاس قریش کی ایک مجلس میں جا کر بیٹھ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر واپس تشریف لے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد حضرت حمزہؓ جو تیر و کمان سے مسلح تھے شکار سے واپس ہوئے ــــ ان کا معمول تھا کہ جب شکار سے لوٹتے تو سیدھے کعبۃ اللہ پہنچ کر طواف کرتے اور وہاں جو مجلسیں جمتی تھیں ان میں سے ہر مجلس

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۱/ ۳۰۲-۳۰۴۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ ۱/ ۴۷۵

میں پہنچ کر سلام کرتے اور تھوڑی دیر بات چیت کرکے گھر واپس ہوتے ـــ عبداللہ بن جدعان کی لونڈی نے انھیں دیکھا تو کہا اے ابوعمارہ (حضرت حمزہؓ کا لقب) کاش آپ وہ منظر دیکھتے جو ابھی پیش آیا۔ ابوالحکم (ابوجہل کا خطاب) نے آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کس قدر اذیت پہنچائی ہے۔ یہاں انھیں بیٹھے دیکھا تو بدزبانی شروع کردی اور ایسی باتیں کرنے لگا جو انھیں ناگوار تھیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ سن کر حضرت حمزہؓ طیش میں آگئے۔ اپنے معمول کے خلاف کسی مجلس میں نہیں گئے۔ سیدھے اس مجلس میں پہونچے جس میں ابوجہل موجود تھا اور کمان اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ وہ زخمی ہوگیا، پھر کہا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو برا بھلا کہتے ہو، میں اس کے دین کو قبول کرتا ہوں اور جو باتیں وہ کہتا ہے وہی میں بھی کہتا ہوں، اگر ہوسکے تو میرا جواب دو۔ یہ دیکھ کر ابوجہل کے قبیلے (بنومخزوم) کے لوگ اس کی حمایت میں کھڑے ہوگئے اور کہا کہ تم صابی (بے دین) ہوگئے ہو۔ ابوجہل نے ان سے کہا انھیں جانے دو اور میں نے واقعی ان کے بھتیجے کو بہت سخت سست اور برا بھلا کہا ہے[1]

یہ بھی روایات میں ہے کہ اس طرح جذباتی انداز میں اسلام لانے پر شیطان نے انھیں وسوسے میں ڈال دیا کہ تم قریش کے سردار ہو اور ایک بے دین کے پیچھے اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ بیٹھے ہو۔ حضرت حمزہؓ سخت پیچ و تاب میں رہے اور رات اس بے چینی کے ساتھ گزاری کہ انھیں ایسی بے چینی کبھی نہیں رہی، دعا کی کہ اگر یہ حق ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دل کھول دے اور اگر غلط ہے تو اس سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا فرمادے۔ صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ اپنی پریشانی اور الجھن کا ذکر کیا اور کہا مجھ جیسے آدمی کے لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ کسی ایسے معاملے میں جما رہوں جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ وہ حق ہے یا نہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ آپ مجھے کچھ تفصیل بتائیں۔ آپ نے انھیں تذکیر اور نصیحت کی۔ خوف دلایا اور خوشخبری سنائی۔ اس کے نتیجے میں اللہ نے آپ کے دل میں ایمان ڈال دیا۔ حضرت حمزہؓ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں۔ آپ اپنے دین کا اعلان کریں، قسم خدا کی

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۲۸-۳۲۹

آسمان کے نیچے جتنی چیزیں ہیں وہ سب مل جائیں تو بھی میں اپنے پہلے دین کو پسند نہیں کروں گا۔[1]

حضرت حمزہؓ قریش کے بہت ہی طاقتور اور مضبوط آدمی سمجھے جاتے تھے۔ کبھی کسی کے سامنے جھکتے نہیں تھے، انھوں نے بغیر کسی خوف کے اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا اور کھل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں

فلما اسلم حمزة عرفت	جب حضرت حمزہؓ اسلام لے آئے
قریش ان رسول الله صلی الله	تو قریش سمجھ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
علیه وسلم قد عزّوا متنع،	کو قوت حاصل ہوگئی ہے اور آپ محفوظ
وان حمزة سیمنعه فکفّوا	ہوگئے ہیں اور حمزہؓ ان کی مدافعت کریں گے
عن بعض ما کانوا ینالون	چنانچہ بعض وہ حرکتیں جو وہ آپ کی شان
منه[2]	میں کرتے تھے ان سے باز آگئے۔

اسلام لانے سے قبل حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بڑا سخت رویہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دلی خواہش تھی کہ ان جیسا مضبوط آدمی اسلام کو مل جائے۔ آپ نے دعا فرمائی تھی۔

اللهم أعزّ الإسلام بأحبّ	اے اللہ! ان دو آدمیوں میں سے
هذین الرجلین الیك بعمر	جو تجھے زیادہ محبوب ہے اس کے ذریعہ
بن الخطاب أو بأبي جهل	اسلام کو تقویت دے۔ عمر بن خطاب
بن هشام[3]	یا ابوجہل بن ہشام۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی:۔

---

[1] ابن کثیر، السیرة النبویة : ۱/ ۴۴۶ ۔ زرقانی، شرح المواہب اللدنیة : ۱/ ۴۷۸

[2] ابن ہشام : السیرة النبویة : ۱/ ۳۲۹

[3] ترمذی ۔ ابواب المناقب، مناقب أبي حفص عمر بن الخطاب ۔ مسند احمد : ۲/ ۹۵ ۔ طبقات ابن سعد: ۳/ ۲۶۹

اللھم أعز الإسلام بعمر[1] — اے اللہ! عمر کے ذریعہ اسلام کو تقویت دے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حضرت عمرؓ کے حق میں دعا کی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو چار امتیازات سے نوازا۔ ان میں سے ایک امتیاز یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے دعا کی تھی۔

اللھم أید الإسلام بعمر[2] — اے اللہ! عمر کے ذریعہ اسلام کی تائید فرما۔

ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ابوجہل اور حضرت عمرؓ دونوں کے لیے اور بعد میں صرف حضرت عمرؓ کے حق میں دعا فرمائی ہو۔[3]

حضرت عمرؓ اسلام کے کتنے شدید مخالف تھے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

ام عبداللہ بنت ابو حثمہ[4] کہتی ہیں کہ ہم حبشہ ہجرت کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میرے شوہر عامر کسی ضرورت سے باہر گئے ہوئے تھے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے بلکہ حالتِ شرک پر قائم تھے اور ہمارے ساتھ ان کی سختی بھی جاری تھی ہمارے گھر آئے اور مجھ سے کہنے لگے اے ام عبداللہ! کیا اب مکہ چھوڑ ہی دینے کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا۔ ہاں، خدا کی قسم اللہ کی زمین میں کہیں بھی نکل

---

[1] حاکم المستدرک: ۸۹/۳۔ دارالکتب العلمیہ۔ لبنان۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اللھم أید الدین بعمر بن الخطاب۔ حوالہ سابق۔

[2] مشکوٰۃ، کتاب المناقب۔ باب مناقب عمر بحوالہ مسند احمد

[3] تفصیل کے لیے دیکھی جائے زرقانی علی المواہب اللدنیہ: ۲/۳-۴۔ ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ: ۴/۸۵-۸۶۔

[4] ان کا نام لیلیٰ تھا۔ قدیم الاسلام تھیں۔ حبشہ اور پھر مدینہ ہجرت کی۔ کہا جاتا ہے کہ خواتین میں سب سے پہلے یہ مدینہ پہونچی تھیں۔ بعض حضرات نے ام سلمہ کا نام لیا تھا۔ ابن حجر۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ: ۸/۳۰۳ دارالکتب العلمیہ۔ لبنان ۱۹۹۵ء

جائیں گے جب تک کہ کوئی بہتر صورت نہ پیدا ہو جائے۔ آپ لوگوں نے ہمیں اذیت پہنچائی ہے اور ہمیں مجبور و مقہور کر رکھا ہے۔ انھوں نے کہا اچھا اللہ تم لوگوں کے ساتھ ہو اور چلے گئے۔ اس وقت میں نے ان کے اندر ایسی رقّت دیکھی جو پہلے نہیں دیکھی تھی۔ میرے خیال میں ہمارے مکّہ چھوڑنے کے فیصلے سے وہ افسردہ اور دلگیر تھے۔ جب میرے شوہر واپس ہوئے تو میں نے کہا کاش آپ اس وقت عمر کی رقّت اور غم کی کیفیت دیکھتے۔ انھوں نے کہا کیا تم یہ توقع کرتی ہو کہ وہ اسلام لے آئیں گے۔ میں نے کہا ہاں، اس پر انھوں نے کہا کہ وہ اس وقت تک اسلام نہیں لا سکتے جب تک کہ خطاب کا گدھا اسلام نہ لے آئے۔ اسلام کے خلاف حضرت عمرؓ کے سخت رویے کی وجہ سے انھیں مایوسی تھی[1]

حضرت عمرؓ کے اسلام کے سلسلے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔

حدیث کی بعض کتابوں میں خود ان کا بیان نقل ہوا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعرّض کرنے اور آپ کو تکلیف پہنچانے کے ارادے سے نکلا۔ میں نے دیکھا کہ آپ مجھ سے پہلے مسجد حرام پہنچ چکے ہیں۔ میں آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ آپ سورہ حاقہ پڑھنے لگے۔ میں قرآن کے اسلوب اور بیان سے حیرت اور تعجب میں پڑ گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ واقعی یہ شاعر ہیں جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ ابھی یہ خیال دل میں آیا ہی تھا کہ آپ نے یہ آیات پڑھیں:۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝	بے شک یہ ایک معزز فرشتہ
وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا	کا (لایا ہوا) کلام ہے۔ یہ کسی شاعر کا قول
مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ (الحاقۃ: ۴۰-۴۱)	نہیں ہے۔ لیکن کم ہی تم ایمان لاتے ہو۔

میں نے کہا یہ تو کاہن معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے تلاوت فرمائی۔

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا	یہ کسی کاہن کا کلام نہیں ہے۔ تم کم
مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ	ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ یہ رب العالمین
رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا	کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اگر پیغمبر

---

[1] ابن ہشام؛ السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۸۰

بَعۡضَ الۡاَقَاوِیۡلِ ○ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡیَمِیۡنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ الۡوَتِیۡنَ ○ فَمَا مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ عَنۡهُ حٰجِزِیۡنَ ○

ہماری طرف کچھ (جھوٹی) باتیں گھڑ کر منسوب کر دیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر ان کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی شخص اس سے بچانے والا نہ ہوتا۔

(الحاقۃ: ۴۴-۴۷)

اسی وقت اسلام میرے دل میں اتر گیا[1]

حضرت عمر کو جس واقعہ نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور جس کے نتیجہ میں ان کو اسلام کی دولت ملی۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت خطاب اور ان کے بہنوئی سعید بن زید، حضرت عمرؓ سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔ لیکن حضرت عمر کی سختی کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کر رہے تھے[2] ایک روز کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر تلوار لیے ہوئے نکلے کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتمہ کر دیں گے۔ راستے میں انہی کے خاندان کے ایک فرد نُعیم بن عبداللہ النحام نے پوچھا عمر! کہاں کا ارادہ ہے؟ کہا کہ میں اس بے دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں جس نے قریش کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اسے بے وقوف بتا رہا ہے، اس کے دین میں عیب نکال رہا ہے، اس کے معبودوں کو ہدفِ تنقید بنا رہا ہے۔ نعیم نے کہا۔ تم دھوکے میں ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے بعد بنو عبد مناف تمہیں زمین پر چلنے کے لیے زندہ چھوڑ دیں گے۔ حضرت عمر نے کہا معلوم ہوتا ہے تم بھی صابی ہو گئے ہو اور اپنا دین چھوڑ چکے ہو۔ اگر مجھے اس کا یقین ہوتا تو میں پہلے تمہیں تہ تیغ کرتا۔ نعیم نے کہا

---

[1] ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۴/۱۳۹، ذہبی، تاریخ الاسلام (السیرۃ النبویہ: ۱/۱۷۳

[2] لیکن بخاری میں خود سعید بن زید کا بیان ہے۔ لو رأیتنی موثقی عمر علی الاسلام انا واختہ، وما اسلم۔ کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر بن الخطاب۔ (اگر تو نے وہ وقت دیکھا ہوتا جب کہ عمر مجھے اور اپنی بہن کو ہمارے اسلام لانے کی وجہ سے باندھ دیا کرتے تھے، اس وقت تک وہ اسلام نہیں لائے تھے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لانے کی وجہ سے حضرت عمرؓ کی اپنی بہن اور بہنوئی پر سختی شروع ہو چکی تھی۔

پہلے اپنے گھر کے حالات کیوں نہیں ٹھیک کرتے ؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیا میرے گھر کا کوئی آدمی مسلمان ہوگیا ہے ۔ انھوں نے جواب ۔ ہاں ۔ خدا کی قسم تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی اور چچازاد بھائی سعید بن زید اسلام لاچکے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرلی ہے ۔ جاؤ پہلے ان کی خبر لو ۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے غصہ سے اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر کا رخ کیا ۔ وہ دونوں اپنے گھر میں حضرت خبابؓ سے سورہ طٰہٰ پڑھ رہے تھے ۔[1]

جب ان لوگوں نے حضرت عمرؓ کی آہٹ محسوس کی تو حضرت خبابؓ گھر کے گوشے میں چھپ گئے ۔ حضرت فاطمہ بنت خطابؓ نے صحیفہ کو اپنی گود میں چھپا لیا ۔ حضرت عمرؓ جب گھر کے قریب پہنچے تو انھوں نے حضرت خبابؓ کے قرآن پڑھنے کی آواز سن لی تھی ۔ پوچھا یہ کیا گنگناہٹ تھی جو میں نے سنی ہے ۔ انھوں نے جواب دیا کوئی خاص بات نہیں ہے ۔ حضرت عمرؓ نے کہا مجھے معلوم ہوا کہ تم لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین اختیار کرلیا ہے اور ان کی پیروی شروع کردی ہے ۔ یہ کہہ کر اپنے بہنوئی سعید بن زید کی طرف بڑھے اور انھیں بری طرح زدوکوب کرنے لگے ۔ حضرت فاطمہ اپنے شوہر کو بچانے کے لیے لپکیں تو انھیں اس زور سے مارا کہ ان کا چہرہ لہولہان ہوگیا ۔ اس پر دونوں نے کہا ۔ ہاں ہم نے اسلام قبول کرلیا ہے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں ۔ اب آپ کا جو دل چاہے کیجئے ۔ بہن نے غصہ سے کہا ایک روایت کے مطابق بہنوئی نے کہا کہ اگر حق آپ کے دین کے علاوہ کہیں اور ہے تو اس کا ساتھ دینا ہی چاہیے ۔ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ (میں شہادت دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے اور محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)

جب حضرت عمرؓ نے بہن کو خون آلود دیکھا تو ندامت محسوس کی ۔ انھیں اندازہ ہوا کہ یہ لوگ پیچھے نہیں ہٹ سکتے ۔ انھوں نے بہن سے کہا جو صحیفہ تم پڑھ رہی تھیں لاؤ دیکھوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون سا دین پیش کر رہے ہیں ؟ — حضرت عمرؓ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ۔

---

[1] مکہ میں جو صحابہ غریب اور نادار ہوتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں ان کے صحابہ کے حوالہ کردیتے جو صاحب حیثیت ہوتے وہ انھیں کھانے میں اپنے ساتھ شریک رکھتے حضرت سعید کے ذمہ میں بھی ایسے دو افراد تھے ۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ : ۴/۱۴۰

بہن نے کہا کہ ڈر ہے کہیں اس کی بے ادبی نہ ہو اور اسے آپ تلف نہ کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے قسم کھائی کہ پڑھنے کے بعد وہ اسے واپس کر دیں گے۔ بہن نے کہا کہ آپ شرک کی وجہ سے ناپاک ہیں اور اس کتاب کو پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ حضرت عمر اٹھے اور غسل (یا وضو) کیا۔ بہن نے صحیفہ دیا جس میں سورۂ طٰہٰ تھی۔ اس کا ابتدائی حصہ پڑھتے ہی بول اٹھے کہ کتنا خوبصورت اور معزز کلام ہے۔ جب اس آیت پر پہنچے:۔

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ	میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تو
اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ	میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے
لِذِكْرِیْ ۝ [1] (طٰہٰ: ۱۴)	نماز قائم کر۔

تو ایمان دل میں اتر گیا۔ کہا کہ مجھے بتاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہیں؟ یہ سنتے ہی حضرت خبّاب جو گھر میں روپوش تھے باہر نکلے اور کہا، اے عمر! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کل ہی دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر یا ابوجہل کے ذریعہ اسلام کی مدد فرما۔ تمہارے لیے خوشخبری ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعا تمہارے حق میں قبول ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خبابؓ سے پوچھا بتاؤ کہ اس وقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہیں تاکہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لے آؤں۔ حضرت خبابؓ نے کہا کہ آپ صفا کے پاس فلاں مکان میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی تلوار حمائل کی اور مکان پر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب حضرت عمر کی آواز سنی تو ایک شخص نے دروازہ کی جھریوں سے دیکھا تو گھبرا کر اطلاع دی کہ عمر تلوار لیے کھڑے ہیں۔ حضرت حمزہؓ نے کہا انھیں آنے کی اجازت دی جائے اگر اللہ نے ان کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا ہے تو وہ اسلام لے آئیں گے

---

[1] ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے صحیفہ سے سورۂ حدید کی تلاوت کی تھی۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۴/۱۴۰۔ یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ سورۂ حدید مدنی ہے اور یہ واقعہ مکہ کا ہے۔ ایک اور واقعہ بھی ملتا ہے کہ حضرت عمرؓ خلوت سے حرم میں رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں قرآن پڑھتے سنا اور اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہیں اسلام لے آئے اور اس کا اعلان کر دیا۔ ابن ہشام ۱/۳۸۵-۳۸۴۔ ذہبی، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۷۳۔ یوں محسوس ہوتا ہے جس طرح ایک موقع پر سورۂ حاقہ کی آیات سے متاثر ہوئے اسی طرح دوسری سورتوں نے بھی ان کے دل و دماغ پر اثر ڈالا۔ بالآخر بہن اور بہنوئی کے واقعہ اور سورۂ طٰہٰ کی تلاوت نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں گے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی نہیں ہے اور وہ کسی غلط ارادے سے آئے ہیں تو انہی کی تلوار سے ان کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انھیں آنے دو۔ ایک شخص نے جاکر اجازت دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمرہ میں ان سے ملاقات کی۔ ان کی چادر اور تلوار کی میان پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا اور کہا ابن خطاب! کس لیے آئے ہو، تم اس وقت تک باز نہ آؤ گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ ولید بن مغیرہ کی طرح تم پر بھی اپنا قہر نہ نازل کر دے۔

حضرت عمرؓ نے کہا میں تو اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤں اور اللہ کی طرف سے وہ دین جو وہ پیش فرما رہے ہیں اس کی اتباع کروں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر بلند کی جس سے سب لوگ سمجھ گئے کہ حضرت عمرؓ اسلام لے آئے ہیں[۱]

حضرت عمرؓ کا شمار قریش کے شرفا میں ہوتا تھا اور اس وقت کے قبائلی نظام میں انھیں سفیر کی حیثیت حاصل تھی۔ قریش کے دو خاندانوں میں یا قریش اور غیر قریش کے ذریعہ کوئی نزاع یا جھگڑا کھڑا ہو جاتا تو ان کے درمیان وہ سفارت کی خدمت انجام دیتے اور فخر و مباہات کا مقابلہ ہوتا تو ان کے نمائندے ہوتے[۲]

حضرت عمرؓ بڑے طاقت ور اور دبدبے والے انسان تھے۔ قریش جس طرح اسلام لانے والوں کو اذیتیں پہنچا رہے تھے اس طرح حضرت عمرؓ پر ہاتھ اٹھانے کی آسانی سے ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد حضرت عمرؓ نے اسے پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ کھل کر اس کا اعلان کیا، جس کسی نے مخالفت کی اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ اسلام لاتے ہی انھوں نے سوچا کہ کون شخص ایسا ہے کہ اس سے میں اپنے اسلام قبول کرنے کا تذکرہ کروں تو مکہ میں وہ ہر طرف اس کا چرچا کر دے۔ کہا گیا جمیل بن معمر الجمحی یہ کام کر سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں یہ دیکھنے کے لیے کہ آپ کیا کر رہے ہیں آپ کے پیچھے پیچھے

---

[۱] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۴۲-۳۴۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۳/۲۶۹ - ۲۲۹

[۲] ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۲/۲۳۵ - ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۴/۱۴۸

چلا۔ اس وقت میری عمر اتنی تھی کہ جو واقعات پیش آئے انھیں سمجھ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ جُمَیل کے پاس پہونچے اور کہا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین میں داخل ہو چکا ہوں ؟ جُمَیل نے یہ سنتے ہی بغیر کچھ جواب دیے اپنے کپڑے سمیٹے اور سیدھے کعبہ کی طرف چلا۔ حضرت عمرؓ بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ جُمَیل کعبہ کے دروازہ پر پہنچا۔ اس وقت لوگ حرم کعبہ کے اندر اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ وہ چلایا لوگو! عمر بے دین ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فوراً جواب دیا۔ جھوٹا ہے، میں نے اسلام قبول کیا ہے اور اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ مجمع بھی بھڑ گیا اور اس کے بعد لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے۔ آپ نے بھی اس کا تابڑ توڑ جواب دیا۔ یہاں تک کہ آپ تھک کر چور ہو گئے اور بیٹھ گئے۔ لوگ آپ کے سر پر کھڑے رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا جو کچھ تم سے ہو سکے کر گزرو، اے دشمنانِ خدا اگر ہم تین سو ہوتے تو تمہیں یہاں سے نکال باہر کرتے۔ اتنے میں ایک بزرگ شخص عمدہ لباس میں پہنچا۔ اس نے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ عمر بے دین ہو گیا ہے۔ اس نے کہا۔ اس نے اپنے لیے ایک بات پسند کی اور اسے اختیار کرلیا ہے۔ آخر تم کیا چاہتے ہو ؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنو عدی اس طرح عمر کو تمہارے حوالہ کر دیں گے۔ ہٹو! اسے جانے دو۔ اس کے بعد مجمع منتشر ہو گیا۔ ہجرت کے بعد میں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ جس شخص نے اس وقت آپ کی حمایت کی تھی وہ کون تھا؟ تو آپ نے فرمایا وہ عاص بن وائل سہمی تھا[1]

---

[1] یہ واقعہ بخاری میں مختصراً آیا ہے۔ ایک روایت سے یہ خیال ہوتا ہے کہ عاص بن وائل کی حمایت کسی دوسرے وقت کی تھی۔ عاص بن وائل سہمی کی حمایت کی وجہ یہ تھی کہ بنو سہم حضرت عمرؓ کے قبیلہ بنو عدی کے حلیف تھے۔ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر بن الخطاب۔ پورے واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۸۷۔ ذہبی تاریخ الاسلام (السیرۃ النبویۃ): ۱/۱۸۶، دار الکتاب العربی۔ بیروت ۱۹۹۴ء۔ نیز ملاحظہ ہو حاکم، المستدرک: ۳/۹۱۔

حضرت عمرؓ نے کس سنہ میں اسلام قبول کیا، اس میں اختلاف ہے۔ اتنی بات یقینی ہے کہ = -

خود حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جس روز میں اسلام لایا اس رات میں نے سوچا

= آپ کے اسلام لانے سے قبل ہجرتِ حبشہ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ بعثت کے چھٹے سال مشرف باسلام ہوئے (طبقات: ۲۷۰/۳) عام طور پر اصحابِ سیرت کا اس پر اتفاق سا ہے۔ بعض حضرات نے سن پانچ کا واقعہ بتایا ہے۔ (زرقانی علی المواہب: ۲/۲) ابن سعد کے بیان کے مطابق اس وقت حضرت عمرؓ ۲۶ سال کے تھے۔ آپ کے صاحبزادے عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ وہ خود اس وقت چھ سال کے تھے۔ (طبقات: ۲۶۹/۳-۲۷۰) حافظ ابن کثیر اوپر کا واقعہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے تاخیر سے اسلام قبول کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ غزوہ احد میں، جو ۳ھ میں ہوا چودہ سال کے تھے۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے وقت ان کی عمر اتنی تھی کہ وہ واقعات کو سمجھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہو گئے تھے (چھ سال اس کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت سے چار سال قبل یا بعثت کے تقریباً نو سال بعد حضرت عمرؓ اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ (السیرۃ النبویۃ: ۳۹/۲-۳۸) حافظ ابن حجر کی تحقیق کے مطابق یہ بعثت کے چھٹے یا ساتویں سال کا واقعہ ہے۔ اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے وقت میں لڑکا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ میں پانچ سال کا تھا۔ ابن عمرؓ احد میں چودہ سال کے تھے اور احد بعثت کے سولہویں ۱۶ سال میں ہوئی۔ اس طرح یہ بات طے ہے کہ ان کی پیدائش بعثت کے دو سال بعد ہوئی۔ اس لحاظ سے حضرت عمرؓ بعثت کے چھ یا سات سال بعد مشرف باسلام ہوئے۔

حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے پہلے چالیس مرد اور دس خواتین اسلام لا چکی تھیں۔ (فتح الباری: ۵۷/۷) حضرت عمرؓ کے اسلام لانے ہی مکہ میں اسلام نمایاں ہو کر سامنے آگیا (ابن سعد، طبقات: ۲۶۹/۳) بعض حضرات نے کہا ہے کہ آپ کے اسلام لانے کے بعد چالیس کی تعداد پوری ہوئی۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ آپ کے اسلام لانے سے قبل انتالیس ۳۹ مرد اور تیئس ۲۳ عورتیں اسلام لا چکی تھیں۔ کم و بیش یہی تعداد بیشتر مورخین نے بیان کی ہے (ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۶۰۱/۱-۶۰۲۔ ابن سعد، طبقات: ۲۶۹/۳۔ ابن اثیر، اسد الغابہ: ۱۳۸/۴-۱۳۹) حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حبشہ ہجرت کرنے والوں کی تعداد ہی اسی سے زیادہ تھی۔ البتہ اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ جو لوگ حبشہ ہجرت کرنے سے رہ گئے تھے وہ چالیس کے قریب تھے۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے ان کی تعداد چالیس ہو گئی۔ (السیرۃ النبویۃ: ۳۳/۲)

کہ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو سب سے بڑا دشمن ہو اسے اپنے اسلام لانے کی اطلاع دینی چاہیے۔ مجھے خیال آیا کہ ابوجہل سے بڑا دشمن کون ہوگا۔ چنانچہ سویرے اس کے گھر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابوجہل باہر نکلا اور دیکھتے ہی کہا۔ بھانجے خوش آمدید کیسے اس وقت آنا ہوا؟[1] میں نے جواب دیا صرف یہ اطلاع دینے حاضر ہوا ہوں کہ میں اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا ہوں اور ان کی تعلیمات کی تصدیق کرتا ہوں۔ ابوجہل نے غصّہ سے دروازہ بند کر لیا اور کہا برا ہو تمہارا اور تمہاری اس اطلاع کا۔[2]

حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کی وجہ سے صحابہ کرام کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ ایک طرح سے ان کو قریش کے مقابلہ میں پناہ مل گئی اور ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔[3]

علامہ ابن جریر طبری نے ان دونوں کے اسلام لانے کے اثرات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

وکان (عمر) رجلاً جلداً جلیداً	حضرت عمرؓ مضبوط اور قوی آدمی
منیعاً، وکان قد اسلم قبل	تھے ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا تھا
ذالک حمزۃ بن عبدالمطلب،	ان سے پہلے حمزہ بن عبدالمطلب اسلام
ووجد أصحاب رسول اللّٰہ	لا چکے تھے۔ ان کی وجہ سے رسول اللہ
صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی أنفسہم قوۃً	صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے اپنے
وجعل الاسلام یفشو فی	اندر قوت محسوس کی اور اسلام قبائل میں
القبائل[4]	پھیلنے لگا۔

---

[1] ابن ہشام اور بعض دوسرے اصحاب نے ابوجہل کو حضرت عمرؓ کا حقیقی ماموں کہا ہے لیکن علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمر کی ماں حنتمہ بنت ہاشم اس کی چچازاد بہن تھیں۔ الاستیعاب: ۳/۲۳۵؛ اسد الغابہ: ۴/۱۴۶

[2] ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۸۷۔ حضرت عمرؓ نے قریش کے ایک اور سردار کے گھر پہونچ کر بھی اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ اس نے بھی وہی رویہ اختیار کیا جو ابوجہل نے کیا۔ اس کے بعد ام جمیل کا واقعہ پیش آیا۔ ذہبی، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۷۸؛ ابن اثیر، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ: ۴/۱۲۱

[3] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۲۷۹ - ۲۸۰

[4] طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/۵۴۹

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

ما زلنا أعزّةً منذ أسلم عمر[1]	حضرت عمرؓ جب اسلام لائے اس وقت سے ہم مضبوط اور قوی رہے۔

ابن ابی شیبہ اور طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا۔

کان إسلام عمر عزّاً وهجرته نصرًا وإمارته رحمةً، والله ما استطعنا ان نصلّي حول البيت ظاهرين حتیٰ أسلم عمر[2]	حضرت عمرؓ کا اسلام لانا عزت و تقویت کا سبب بنا، ان کی ہجرت نصرت کا اور ان کا دور امارت رحمت کا ذریعہ ثابت ہوا۔ قسم خدا کی حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہم نکل کر بیت اللہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ ہم خانہ کعبہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو انھوں نے مشرکین کا مقابلہ کیا۔ بالآخر انھوں نے اس کی اجازت دے دی، حضرت عمرؓ نے خود بھی خانہ کعبہ میں نماز پڑھی اور ہم نے بھی پڑھی[3]

حضرت صہیب بن سنان رومیؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لے آئے تو اسلام بالکل نمایاں ہوگیا اور علانیہ اس کی دعوت دی جانے لگی، ہم لوگ حلقے بناکر خانہ کعبہ کے اطراف بیٹھنے لگے، طواف شروع کردیا، جو لوگ ہمارے ساتھ سختی کرتے ان سے انتقام لیتے اور ان کی بعض باتوں کا جواب بھی دیتے[4]

تاریخوں میں حضرت عمرؓ کے اعلان و اظہار اور دعوتی دوڑ دھوپ کے بارے

---

[1] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر بن الخطاب۔

[2] ابن حجر، فتح الباری: ۷/۴۸۔ روایت کا آخری حصہ مستدرک حاکم میں بھی ہے۔ ۳/۹۰

[3] ابن سعد، طبقات: ۳/۲۷۰۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۸۰۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۳۲
ابن اثیر، اسد الغابہ: ۴/۱۴۴

[4] ابن سعد، طبقات: ۳/۲۶۹

میں لکھا ہے۔

واتبع عمر المجالس التی	حضرت عمرؓ ان مجلسوں میں پہونچے
کان یجلس فیہا فأظہر الایمان	جن میں وہ بیٹھا کرتے تھے اور بغیر کسی
غیر ھائب ولا خائف[1]	خوف اور اندیشہ کے اپنے ایمان کا اظہار کیا۔

جب قریش نے دیکھا کہ مسلمانوں کو حبشہ میں پناہ حاصل ہوگئی ہے، حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسی شخصیتیں اسلام کو مل گئی ہیں، اسلام مختلف قبائل میں پھیل رہا ہے اور اس کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے تو انھوں نے ایک طرف مسلمانوں پر زیادہ سختی شروع کردی اور وہ ان پر مزید ظلم وستم ڈھانے لگے، دوسری طرف انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ قتل کردیں گے۔ ابوطالب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کو جمع کیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی گھاٹی (شعب ابی طالب) میں پہونچادیں اور آپ کی حمایت میں کمر کس لیں[2] خاندان کے سب لوگ اس پر متفق ہوگئے۔ مسلمانوں نے اپنے دین وایمان کی وجہ سے اور جنھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا، انھوں نے خاندانی حمیت کی بنا پر اس کا ساتھ دیا۔ صرف ابولہب اس سے الگ رہا۔ اس نے مشرکینِ قریش کی حمایت کی۔

روایات میں آتا ہے کہ اس زمانہ میں ابوطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت حفاظت کرتے تھے۔ رات میں سونے کا وقت ہوتا تو آپ سے کہتے کہ آپ اپنے بستر پر آرام کریں، تاکہ دشمن یہ سمجھیں کہ آپ اپنے بستر پر ہیں۔ جب سب لوگ سوجاتے تو اپنے کسی لڑکے یا بھائی یا چچا کے لڑکوں میں سے کسی کو حکم دیتے کہ وہ آپ کے بستر پر لیٹ جائے اور آپ سے درخواست کرتے اس کے بستر پر سو جائیں۔

ابوطالب کی قیادت میں بنو ہاشم اس طرح آپ کی حمایت میں کھڑے ہوگئے تو قریش نے ایک سخت وار کیا۔ انھوں نے مشترکہ طور پر بنو ہاشم کے مقاطعہ کا فیصلہ کیا اور ایک تحریر لکھی کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب سے شادی بیاہ، لین دین، تجارت کا معاملہ نہیں

---

[1] دیار بکری، الخمیس فی احوال انفس نفیس: ۳۳۵/۱

[2] شعب ابی طالب مکہ کی آبادی سے باہر تھی۔ السیرۃ الحلبیۃ : ۲۵/۲

ہوگا۔ان کی خوشی اور غم میں کوئی شریک نہ ہوگا اور نہ کسی کی مسرت اور غم میں انھیں شریک ہونے دیا جائے گا۔ ان سے کبھی صلح ہوگی اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کی نرمی روا رکھی جائے گی۔ اس معاہدے کی پابندی کا عہد و پیمان باندھا گیا اور اسے خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا تاکہ معلوم ہو کہ یہ پکا معاہدہ ہے[1]

قریش کی طرف سے اس بائیکاٹ یا مقاطعہ کے نتیجہ میں بنو ہاشم کو سخت مشکلات سے گزرنا پڑا اور بڑی تکلیفیں انھوں نے اٹھائیں۔قریش انھیں بازار تک پہونچنے نہیں دیتے تھے۔ اگر باہر سے غلہ فروخت کے لیے آتا تو جلدی سے خرید لیتے تاکہ بنو ہاشم خرید نہ سکیں۔ بھوک سے بچوں کے تڑپنے اور بلبلانے کی آواز وادی سے باہر تک سنی جاتی تھی۔کوئی شخص کھل کر ان کی مدد نہیں کرسکتا تھا۔صلۂ رحمی کے جذبہ کے تحت کوئی ان کی مدد بھی کرتا تو بہت خاموشی سے اور پوشیدہ طور پر کرتا تھا[2]

ابن جریر طبری فرماتے ہیں۔

فأقاموا على ذالك من	اس حال میں انھوں نے دو یا تین
أمرهم سنتين أو ثلاثاً حتى	سال تک انھیں رکھا۔یہاں تک انھوں
جهدوا الا يصل الى أحد	نے کوشش کی کہ ان میں سے کسی کے
منهم شيئ الاسرًّا. مستخفيا	پاس کوئی چیز پہونچنے نہ پائے۔سوائے
به من اراد صلتهم من	اس کے کہ جو ان کے ساتھ صلۂ رحمی کرنا

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۳۸۸۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۲۰۹۔طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/ ۵۴۹۔ اس معاہدہ کو منصور بن عکرمہ بن ہاشم یا نضر بن حارث نے تحریر کیا تھا۔ابن ہشام اور ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دعا کی وجہ سے اس کے ہاتھ شل ہو گئے تھے۔ اس تحریر کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ ام الجلاس بنت مخربہ کے پاس تھی، جو ابوجہل کی خالہ تھی۔ابن سعد: ۱/ ۲۰۹۔اس کی ایک توجیہ یہ کی گئی ہے کہ خانہ کعبہ میں آویزاں کرنے سے پہلے شاید یہ صحیفہ ابوجہل کی خالہ کے پاس تھا۔یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی نقل اس کے پاس رہی ہو۔السیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۵

[2] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/ ۴۴-۴۵۔ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/ ۲۰۹

شئی ۔ [1]	چاہتا خاموشی سے اور خفیہ طریقہ سے ان تک کچھ پہونچا دے ۔

اسی زمانہ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکیم بن حزام بن خویلد اپنے غلام کے ساتھ جا رہے تھے ۔ غلام گیہوں لیے ہوئے تھا تاکہ ان کی پھوپھی خدیجہ بنت خویلد کے پاس پہونچائے ۔ حضرت خدیجہؓ بھی شعبِ ابی طالب میں محصور تھیں ۔ راستہ میں حکیم بن حزام کی ابوجہل سے ملاقات ہوگئی ۔ وہ ان سے الجھ گیا اور کہا کہ کیا تم بنوہاشم کو غذا کا سامان پہونچا رہے ہو ؟ قسم خدا کی تم یہیں رکے رہو میں مکہ میں تمہیں رسوا کرکے چھوڑوں گا ۔ اتنے میں ابوالبختری آگیا ۔ اس نے پوچھا کیا بات ہے ؟ ابوجہل نے جواب دیا کہ یہ بنوہاشم کے ہاں غلہ پہونچا رہا ہے ۔ ابوالبختری نے کہا کہ اس کی پھوپھی کا گیہوں اس کے پاس تھا، اسے وہ دینے جارہا ہے ۔ کیا تم اسے اس سے منع کردگے ؟ اس شخص کو جانے دو ۔ ابوجہل نے انکار کردیا ۔ اس پر بات بڑھی تو ابوالبختری نے اسے خوب زدوکوب کیا اور اونٹ کی ایک ہڈی سے اسے مار کر زخمی کردیا ۔ حضرت حمزہؓ قریب ہی سے یہ دیکھ رہے تھے ۔ قریش کو یہ بات ناگوار گزر رہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو اس کا علم ہو اور وہ خوشی منائیں ۔ ابن ہشام کہتے ہیں :۔

ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ذالک یدعو قومہ لیلاً ونہاراً وسراً وجہراً منادیاً بأمر اللہ لا یتقی فیہ احداً من الناس [2]	اس سب کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو شب و روز پوشیدہ اور علانیہ اللہ کے دین کی دعوت اور اس کے احکام کو کھول کر بیان کرتے تھے اس معاملے میں کسی بھی شخص سے خوف نہیں کھاتے تھے ۔

---

[1] تاریخ الامم والملوک : ۱/۵۵۰ ۔ ابن ہشام کے الفاظ کسی قدر مختلف ہیں مفہوم ایک ہے ۔ السیرۃ النبویۃ : ۱/۳۹۱ ابن سعد کہتے ہیں کہ بعثت کے ساتویں سال محرم میں یہ لوگ شعب ابی طالب میں پہونچے اور تین سال رہے طبقات ۱/۲۰۹ ۔ ایک روایت دو سال کی بھی نقل کی ہے ۔ ص ۲۱۰ ۔ غالباً تیسرا سال پورا نہیں ہوا تھا ۔ اس لیے کسی نے دو سال اور کسی نے تین سال کہا ہے ۔

[2] السیرۃ النبویۃ : ۱/۳۹۲ ۔ طبری کے الفاظ اور واضح ہیں ۔ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی کل =

ہشام بن عمرو بن الحارث العیمری نے اس دور میں بڑی مدد کی۔ اس کا بنو ہاشم سے نانہالی رشتہ تھا اور اپنی قوم میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا اور شرف و منزلت کا مقام رکھتا تھا۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ وہ رات میں اونٹ پر کھانے پینے کا سامان لاد کر شعب ابی طالب کی طرف لے جاتا اور نکیل سے آزاد کرکے اسے وادی کی طرف ہانک دیتا۔ اونٹ وہاں پہونچ جاتا اور یہ سامان محصور لوگوں کے کام آتا۔ پھر کسی موقع پر اسی طرح کپڑے پہونچا دیتا[1]

جب اسی طرح دو سال گزر گئے اور تیسرا سال شروع ہوگیا تو قریش کے بعض افراد کو خاص طور پر ان لوگوں کو جن کا نانہالی رشتہ بنو ہاشم سے تھا یہ احساس ہوا کہ یہ فیصلہ غلط ہوا۔ اس سے خونی رشتے متاثر ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق تلف ہوئے ہیں اسے ختم ہوجانا چاہیے[2]

اس معاہدہ کے ختم کرانے میں سب سے اہم رول اسی ہشام بن عمرو بن الحارث العیمری نے انجام دیا۔ وہ زہیر بن ابی امیہ کے پاس گیا اور کہا زہیر! بتاؤ کیا تمہیں

= ذلك يدعو قومه سرًّا وجهرًا آناء الليل وأناء النهار والوحي عليه من الله متتابع بأمره ونهيه ووعيد من ناصبه من العداوة والحجج لرسول الله على من خالفه تاریخ الامم والملوك: ۱/۵۵۰ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان حالات میں بھی اپنی قوم کو خفیہ اور علانیہ طور پر دن کے اوقات میں بھی اور رات کے اوقات میں بھی دعوت دے رہے تھے۔ اس دوران میں اللہ کی طرف سے آپ پر مسلسل وحی نازل ہو رہی تھی جس میں اس کے احکام و نواہی تھے، جو لوگ آپ سے عداوت کر رہے تھے ان کے لیے وعید تھی اور آپ کے مخالفین کے جواب میں دلائل تھے۔

[1] ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۱۲۔ ابن کثیر: السیرۃ النبویۃ: ۲/۴۷

[2] حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔ فلما كان رأس ثلاث سنين تلاوم رجال من بني عبد مناف ومن قصي ورجال من سواهم من قريش قد ولدتهم نساء من بني هاشم ورأوا أنهم قد قطعوا الرحم واستخفوا بالحق۔ السیرۃ النبویۃ: ۲/۴۴۔ نیز ملاحظہ ہو ص ۴۶۔ ذہبی، السیرۃ النبویۃ: ۱/۲۲۲۔ یعنی تیسرے سال کے شروع میں بنو عبد مناف اور قصی بن کعب کے بعض افراد اور ان کے علاوہ قریش کے کچھ لوگ، جن کی مائیں بنو ہاشم کی تھیں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان سے قطع رحم اور حق تلفی کا ارتکاب ہوا ہے۔

یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تم کھاؤ، پیو، تمہارے ہاں شادی بیاہ بھی ہو اور تمہارے سب ماموں اس حال میں پڑے رہیں جس سے تم واقف ہو کہ ان کے ساتھ نہ خرید و فروخت ہو رہی ہے اور نہ ان سے شادی بیاہ کا معاملہ ہو رہا ہے؟ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ابوالحکم (ابوجہل) کے ماموؤں کا معاملہ ہوتا اور اسے اس طرح کے مقاطعہ کے لیے کہا جاتا تو وہ کبھی اس کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ زہیر نے کہا بتاؤ میں تنہا اس میں کیا کر سکتا ہوں! اگر میرے ساتھ کوئی اور ہوتا تو میں کھڑا ہوتا اور اسے چاک کر کے رکھ دیتا۔ ہشام نے کہا۔ ایک اور شخص تمہارے ساتھ ہے۔ اس نے دریافت کیا۔ وہ کون؟ زہیر نے کہا میں خود تمہارے ساتھ ہوں۔ اس نے کہا اچھا تو ایک تیسرے کو تلاش کرو۔

اس کے بعد وہ مطعم بن عدی کے پاس گیا اور کہا کہ کیا تم اسے پسند کرتے ہو کہ بنو عبد مناف کی دو شاخیں ختم ہو جائیں اور تم اسے دیکھتے اور قریش کی موافقت کرتے رہو۔ قسم خدا کی! اگر انھیں موقع دو گے تو وہ انھیں ختم کر کے رکھ دیں گے۔ معطم نے کہا۔ بھلا ہو تمہارا بتاؤ تنہا میں کیا کروں؟ اس نے کہا تمہارے ساتھ دوسرا بھی ہے۔ مطعم نے دریافت کیا وہ کون؟ ہشام نے کہا میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس نے کہا کہ ایک تیسرا شخص بھی تلاش کرلو۔ اس نے جواب دیا یہ کام کر چکا ہوں۔ اس نے پوچھا وہ کون ہے۔ کہا زہیر بن ابو امیہ۔ اس نے کہا اچھا چوتھے شخص کو تلاش کرو۔

اب ہشام، بختری بن ہشام کے پاس پہونچا اور مطعم بن عدی سے جو بات کی تھی وہی اس سے بھی کی۔ اس نے پوچھا کہ اس معاملہ میں تمہاری مدد کے لیے کوئی تیار بھی ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں! اس نے پوچھا وہ کون ہے؟ اس نے بتایا زہیر بن ابو امیہ۔ مطعم بن عدی اور میں خود تمہارے ساتھ ہوں۔ اس نے کہا اچھا تو پانچویں فرد کو تلاش کرو۔

اس کے بعد اس نے زمعہ بن اسود سے بات کی۔ بنو ہاشم کی قرابت اور ان کے حق کا ذکر کیا۔ اس نے بھی پہلے ہی سوال کیا کہ جس کام کے لیے تم مجھ سے کہہ رہے ہو کیا اس میں کوئی ساتھ دے گا؟ اس نے کہا ہاں۔ پھر ان سب کے نام بتائے جن سے وہ گفتگو کر چکا تھا۔

یہ لوگ باہم مشورہ سے رات میں مکہ کے بالائی مقام حجون میں جمع ہوئے اور طے کیا

کہ اس صحیفہ کے مسئلہ کو چھیڑیں گے اور اسے ختم کریں گے۔ زہیر نے کہا کہ سب سے پہلے میں بولوں گا۔ صبح ہوئی تو یہ لوگ حرم میں جہاں قریش کی مجلسیں جمتی تھیں پہونچے۔ زہیر نے صاف ستھرے لباس میں طواف کیا، اس سے فارغ ہو کر لوگوں سے خطاب کیا۔ اے اہل مکہ! کیا ہم کھائیں پئیں، پہنیں اوڑھیں اور بنو ہاشم ہلاک ہوں کہ انھیں خرید و فروخت کی بھی اجازت نہیں ہے۔ قسم خدا کی میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ یہ ظالم اور رشتوں کو قطع کرنے والا صحیفہ چاک نہ کر دیا جائے۔

ابو جہل کعبہ کے ایک گوشہ میں تھا، اس نے کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ صحیفہ چاک نہیں ہوگا۔ زمعہ بن اسود نے کہا کہ سب سے بڑے جھوٹے تو تم ہو جب یہ لکھا گیا اس وقت بھی ہم اس سے خوش نہیں تھے۔ ابو البختری نے زمعہ کی تائید کی کہ یہ سچ کہہ رہے ہیں ہم بھی اس سے خوش نہیں ہیں اور اسے تسلیم نہیں کرتے۔ مطعم بن عدی نے آواز بلند کی کہ تم دونوں صحیح کہہ رہے ہو اور جو اس کے خلاف بولتا ہے غلط بولتا ہے۔ میں اس صحیفہ سے اور اس کے مضمون سے برارت کا اعلان کرتا ہوں۔ ہشام بن عمرو نے اس کی تائید کی۔

ابو جہل نے چاروں طرف سے ایک ہی طرح کی بات سن کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ رات میں کسی جگہ آپس میں مشورہ کے بعد ہو چکا تھا۔

ابو طالب مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ مطعم اس صحیفہ کو پھاڑنے کے لیے آگے بڑھا تو دیکھا کہ دیمک اسے کھا چکی ہے۔ سوائے 'بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ' کے الفاظ کے[۱]

ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب سے کہا کہ اللہ کے حکم سے اس صحیفہ کو دیمک لگ گئی ہے۔ اس میں جہاں کہیں اللہ کا نام تھا وہ تو باقی رہ گیا ہے اور ظلم و زیادتی، قطعِ رحم اور جھوٹ اور بہتان کے جو الفاظ

---

[۱] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۷۱-۳۸۱۔ ابن سعد نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے کہ صحیفہ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ صرف 'باسمک اللہم' کے الفاظ باقی رہ گئے تھے۔ طبقات: ۱/۲۰۹-۲۱۰

تھے وہ سب مٹ گئے ہیں۔ ابو طالب نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی خبر دی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں ؛ اس کے بعد ابو طالب قریش کے پاس گئے اور کہا کہ میرے بھتیجے نے صحیفہ کے بارے میں یہ کچھ بتایا ہے۔ لاؤ دیکھیں۔ اگر اس کی بات صحیح نکلے تو اس قطعِ رحم سے باز آجاؤ اور صحیفہ کو ختم کرو۔ اگر اس کی بات غلط نکلے تو میں اسے تمہارے حوالہ کر دوں گا۔ جب صحیفہ دیکھا گیا تو آپ کی بات صحیح نکلی لیکن قریش بائیکاٹ ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے بلکہ ان کی مخالفت اور شدید ہوگئی۔

اس کے بعد صحیفہ کو ختم کرنے کے سلسلہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اوپر ہوا ہے[1]۔ اس واقعہ کی اور تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ ان میں بعض باتوں میں کسی قدر اختلاف ہے۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ جب صحیفہ کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات صحیح نکلی تو قریش کے ہوش اڑ گئے اور وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اس پر ابو طالب نے کہا کہ جب حقیقت واضح ہوگئی ہے تو آخر اس قید و بند کا کیا جواز ہے؟ پھر ابو طالب اور آپ کے ساتھیوں نے کعبہ اور غلافِ کعبہ کے درمیان پہونچ کر دعا کی۔" اے اللہ! جو لوگ ہم پر ظلم و زیادتی کر رہے ہیں، خونی رشتے ختم کر رہے ہیں اور وہ رویّہ اختیار کر رہے ہیں جو ان کے لیے جائز نہیں ہے، ان کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما"۔ یہاں سے یہ لوگ پھر وادی میں چلے گئے۔

اس کے بعد قریش کے بعض لوگوں کو اس صورتِ حال پر افسوس ہوا اور وہ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ ان میں مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن اسود، ابو البختری بن ہاشم اور زہیر بن ابو امیہ شامل تھے۔ یہ لوگ مسلح ہو کر بنو ہاشم اور بنو مطلب کے پاس پہونچے اور کہا کہ آپ لوگ اپنے گھروں کو واپس چلیں۔

اس واقعہ سے قریش نے سمجھ لیا کہ یہ لوگ بنو ہاشم کو ان کے حوالہ نہیں کریں گے[2]۔

اس صحیفہ یا تحریر کا جو حصہ باقی رہ گیا اور جو مٹ گیا اس کے متعلق ایک دوسری

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ : ۱/۲۱۵

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۱۰

بات بھی کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اس میں جہاں کہیں اللہ کا نام تھا دیمک نے اسے محو کردیا اور شرک، ظلم اور قطع رحم سے متعلق جو حصہ تھا اسے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔ آپ نے ابو طالب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے ستاروں کی قسم کھا کر کہا کہ اس نے مجھ سے غلط نہیں کہا ہے۔ اب ابو طالب اپنے لوگوں کو لے کر قریش کی مجلس میں گئے۔ قریش نے سمجھا کہ یہ لوگ مقاطعہ اور اس سے درپیش مشکلات سے گھبرا گئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاید ان کے حوالہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ابو طالب نے ان سے کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان بہت سی باتیں ہوئی ہیں۔ میں ان کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ اپنا صحیفہ لاؤ۔ شاید ہمارے درمیان صلح کی کوئی صورت نکل آئے۔ وہ لوگ بخوشی صحیفہ لے آئے اور ابو طالب سے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ آپ لوگ ہماری بات مان لیں اور ایسا رویہ اختیار کریں جس سے آپ کی قوم ایک ہو سکے۔ یہ ایک شخص ہے جس نے ہمارے آپس کے تعلقات قطع کرا دئے ہیں اور آپ کی پوری قوم کو ہلاکت اور تباہی تک پہونچا دیا ہے۔

ابو طالب نے کہا کہ میں بالکل انصاف کی بات تمہارے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے اور اس کی بات غلط نہیں ہوتی، کہ اللہ نے تمہارے اس صحیفہ سے براءت کا اظہار کیا ہے۔ اس میں اس کا نام جہاں کہیں تھا اسے محو کر دیا ہے اور دھوکے، قطع رحم اور ہمارے خلاف ظلم و زیادتی کی جو عبارت تھی اسے چھوڑ دیا ہے۔ اگر اس کی بات صحیح ہے تو سوچ لو۔ خدا کی قسم، اس صورت میں جب تک ہم میں کا ایک بھی فرد زندہ ہے ہم اسے تمہارے حوالہ نہیں کریں گے لیکن اگر اس نے جو کہا وہ غلط نکلے تو ہم اسے تمہارے حوالہ کئے دیتے ہیں۔ چاہے تم اسے قتل کر دو یا زندہ رہنے دو۔ انھوں نے کہا ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ جب صحیفہ کھولا گیا تو آپ کی بات صحیح نکلی۔ لیکن مخالفین اپنی بات سے مکر گئے اور کہنے لگے کہ تمہارے آدمی نے جادو کر دیا ہے[1]

قریش نے اسلام کی راہ روکنے کی جو زبردست کوشش کی اسے اللہ تعالیٰ نے

---

[1] ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۲/۴۴-۴۶

ان لوگوں کے ذریعہ ناکام کردیا جو اسلام کو اس کا دین نہیں مانتے تھے۔ جن کا دین و مذہب وہی تھا جو مخالفین کا تھا۔ ایک طرف آپ کا خاندان ابو طالب کی قیادت میں کھڑا ہوگیا اور پوری قوت سے آپ کا دفاع کیا، آخر وقت تک آپ کی حفاظت کی۔ کسی دباؤ کو انھوں نے قبول کیا اور نہ کسی کے سامنے جھکے اور آپ کی خاطر قید و بند کی شدید تکلیف برداشت کی۔ دوسری طرف بعض غیر مسلم سرداران قبائل ہی نے اس قید و بند اور مقاطعہ کو ختم کرایا جس میں آپ، آپ کے خاندان کے اہلِ ایمان بلکہ پورا خاندان بنو ہاشم گرفتار تھا۔ انھوں نے جیسا کہ بعض روایات بتاتی ہیں نہ صرف یہ کہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی بلکہ طاقت کے زور سے اسے ختم کرا کے چھوڑا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ایسی صورتیں بھی پیدا کر سکتا ہے کہ اسلام کو نہ ماننے والے بھی نازک وقت میں اس کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں اور ظلم و عدوان کو ختم کرنے میں اپنا رول ادا کریں۔

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی کی ایک اہم پیشکش

مذہب کا اسلامی تصوّر

مولانا سلطان احمد اصلاحی

اس کتاب میں معاملاتِ دنیا سے مذہب کی بے دخلی کے تصور کو اس کے خاص تاریخی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ چرچ کے ناقابلِ بیان مظالم کے نتیجے میں یورپ میں چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی اور مسیحیت سے بے زاری کے ساتھ خود مذہب سے بے زاری پیدا ہوگئی تھی۔ دوسرے باب میں قرآن اور سنت کی روشنی میں اسلام کے مطلوبہ تصوّرِ مذہب کو پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

آفسٹ کی عمدہ طباعت صفحات ۵۹۱ . قیمت مجلد صرف ۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے
ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ ابو الفضل انکلیو۔ نئی دہلی ۲۵

اسرار الفاتحہ

ایک تعارف

پروفیسر کبیر احمد جائسی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر فارسی زبان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں معارج النبوۃ مشہور ترین کتاب ہے جس کے مصنف نویں صدی ہجری کے ایک واعظ، عالم اور مفسر معین الدین فراہی ہروی ہیں۔ اردو دنیا اُن کے نام سے غالباً پہلی بار ۱۹۲۷ء میں اس وقت واقف ہوئی جب حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم نے خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب فارسی دیوان پر اپنا معرکۃ الآرا مقالہ لکھ کر اسی معارج النبوۃ میں درج اشعار کے ذریعہ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب دیوان پر سوالیہ نشان لگا دیا اور متعدد اشعار پر اس یقین کی مہر بھی ثبت کردی کہ وہ اشعار معین الدین فراہی ہروی کے ہیں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نہیں۔

نگاہ عقیدت میں حافظ محمود خاں شیرانی کی تحقیق کھٹکتی رہی اور تقریباً ربع صدی تک اگر مگر کا سلسلہ چلتا رہا۔ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کے ایک اہم مقالے کے ذریعہ اردو دنیا نے دوبارہ معین الدین فراہی ہروی کا نام سنا۔ بات یوں ہوئی کہ معین الدین فراہی ہروی کی تفسیر سورۂ فاتحہ کا ایک مطبوعہ مگر کم یاب نسخہ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرحوم کی نظر سے گذرا جس کے غائر مطالعہ کے ذریعہ انھوں نے حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کی تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے اور بہت سے اشعار کو اس کے اصل مالک یعنی معین الدین فراہی ہروی کے حوالے کردیا۔ علم کا کارواں اسی طرح آگے بڑھتا ہے۔

اخلاقیات کے موضوع پر فارسی میں منجملہ اور کتابوں کے ایک کتاب اخلاقِ جہانگیری بھی ہے جو معین الدین فراہی ہروی کے پوتے نورالدین خاقانی کی تصنیف

ہے۔ افسوس ہے کہ یہ اہم اور ضخیم کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے مخطوطے کا ایک عکس جب پروفیسر محمد اسلم مرحوم کے مطالعے میں آیا تو ان کو معلوم ہوا کہ دیوان خواجہ معین الدین چشتی کے جو اشعار معارج النبوۃ اور تفسیر سورۂ فاتحہ میں نہ مل سکے تھے وہ اخلاق جہانگیری میں معین الدین فراہی ہروی کے نام سے موجود ہیں۔ انھوں نے اپنا حاصل مطالعہ مجلۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ جلد ۱۳ نمبر ۱-۲ میں شائع کروادیا ہے۔ اس طرح تحقیق کا کارواں دو قدم اور آگے بڑھا۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر کی طرح معین الدین فراہی ہروی نے سورۂ یوسف کی بھی مفصل تفسیر لکھی ہے جس کا پہلا ایرانی ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ استاذ محترم پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اس کا ناقدانہ مطالعہ غالبًا ۱۹۹۰ء کے آس پاس کیا۔ اس ناقدانہ مطالعہ کے دوران ان کو اس بات کا مزید ثبوت ملا کہ معین الدین فراہی ہروی کے بہت سارے اشعار خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نام سے منسوب ہو گئے ہیں۔ استاذ محترم پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنا حاصل مطالعہ جنوری ۱۹۹۱ء کے معارف اعظم گڈھ میں شائع کروایا جو معارف کے صفحہ ۵ سے ۲۴ تک پر محیط ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ استاذ محترم نے معین الدین فراہی ہروی کی ایک اور تصنیف اعجاز موسوی کے ایک مخطوطے کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور اس کو بھی بطور شاہد پیش کیا ہے

اِن چاروں بزرگوں کے مقالوں کے ذریعہ اردو دنیا معین الدین فراہی ہروی کے نام اور اُن کے شاعرانہ کمالات سے بیگانہ نہیں ہے اور یہ بھی جان چکی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک اچھے طومار نویس، نثار، واعظ اور مفسر تھے۔ مذکورہ بالا بزرگوں نے اُن کی فارسی نثر کی تحلیل و تجزیہ کا کام اپنی بعد کی نسل کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ میں اپنی نسل کی نمائندگی کرتے ہوئے معین الدین فراہی ہروی کی تفسیری تحریروں کا ایک مختصر تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ معارج النبوۃ اور ان کی دوسری نثری تحریروں پر فارسی زبان و ادب کا کوئی طالب علم کام کرنے کا بیڑا اٹھائے گا۔

معین الدین فراہی ہروی کی تفسیری خدمات سے واقف ہونے سے پہلے ہم کو اُن کے اور اُن کے زمانے کے بارے میں تھوڑی سی معلومات ہو جانی چاہیے

تاکہ اُن کی دماغی ساخت اور اُن کی خدمات کی اہمیت و معنویت کو سمجھنا آسان ہو سکے۔

معین الدین فراہی ہروی ہرات کے واعظوں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی خود بھی ہرات کے مشہور واعظ تھے اور اُن کے دوسرے بیٹے نظام الدین بھی واعظ اور ہرات کے قاضی تھے۔ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے معین الدین فراہی ہروی کو مذہبی تعلیم کے حصول کا بھرپور موقع ملا۔ اپنے زمانے کی مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ صرف واعظ ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک شاعر اور مذہبی مصنف کی حیثیت سے بھی علمی دنیا کے پیش منظر پر ابھرے اور زندگی بھر وعظ اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ میر علی شیر نوائی کی کتاب 'مجالس النفائس' معین الدین فراہی ہروی کے عہد حیات ہی میں ترتیب پائی تھی، یہی کتاب اُن کے حالات زندگی کو جاننے کا اولین ماخذ بھی ہے۔ اس کے علاوہ معین الدین فراہی ہروی کے انتقال کے تقریباً انیس برسوں کے بعد غیاث الدین خواندمیر نے ۹۲۷ھ میں جب اپنی کتاب 'حبیب السیر' لکھی تو اس نے بھی معین الدین فراہی ہروی کی زندگی کے بارے میں کچھ معلومات محفوظ کر دیں۔ یہاں اس بات کی یاد دہانی مفید ہوگی کہ علی شیر نوائی کی کتاب مجالس النفائس کا سال تالیف ۸۹۶ھ ہے یعنی یہ کتاب معین الدین فراہی ہروی کے انتقال کے تقریباً چودہ برس پہلے لکھی گئی تھی۔ معین الدین فراہی ہروی کے انتقال کے بیس اکیس برس کے بعد مجالس النفائس کا فارسی زبان میں ایک ترجمہ شہر ہرات میں فخری ہروی نے 'لطائف نامہ' کے نام سے کیا ہے۔ فخری نے اس ترجمہ میں علی شیر نوائی کی ترکی عبارت کو فارسی زبان کے قالب میں ڈھالا ہے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے۔ اِس کے ایک سال بعد ۹۲۹ھ میں 'مجالس النفائس' کا دوسرا فارسی ترجمہ ایک دوسرے ایرانی محمد بن المبارک قزوینی نے ترکی کے شہر اسلامبول میں کیا۔ محمد بن المبارک قزوینی کے ترجمے کی اہمیت اس پہلو سے بہت ہے کہ قزوینی نے معین الدین فراہی ہروی کے بارے میں بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو کسی اور کتاب میں نہیں ملتیں۔ چونکہ یہ باتیں معین الدین ہروی کے انتقال کے اکیس بائیس برس کے بعد ہی ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں اس لیے اِن باتوں کو ایک اہم

اور تقریباً معاصر ماخذ کی حیثیت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہم مناسب مقام پر محمد بن المبارک قزوینی کے بیان کو بھی من وعن نقل کریں گے۔

فخری ہروی کے ترجمۂ 'مجالس النفائس' کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ میر علی شیر نوائی نے معین الدین فراہی ہروی کا بڑا مختصر سا تذکرہ کیا ہے جس میں اُن کا شمار اپنے زمانے کے مشاہیر میں کیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرحوم نے فخری ہروی کی فارسی عبارت کا اردو ترجمہ اِن الفاظ میں کیا ہے:

"مولانا معین واعظ مولانا حاجی محمد فرہی (فراہی) کا بیٹا مشاہیر میں سے ہے۔ فی الحال شہر کا مقرر کردہ واعظ ہے۔ یہ مطلع اُس کا ہے:

مگر فصل بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد
مگر وصل نگار آمد کہ دل با وصل ہمدم شد[1]

اِس کے برعکس معین الدین فراہی ہروی کے انتقال کے انیس برس کے بعد غیاث الدین خواندمیر نے اپنی کتاب 'حبیب السیر' میں ان کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ قدرے مفصل ہیں۔ پہلے ہم غیاث الدین خواندمیر کے اصل الفاظ بعد ازاں اُس کا اردو ترجمہ پیش کریں گے:

" مولانا معین الدین الفراہی برادر ارشد قاضی نظام الدین بود و بسیاری از فضائل وکمالات اظہار وقوف می نمود۔ در زہد و تقویٰ درجۂ علیا داشت و اکثر خطوط را در غایت جودت بر صفحہ تحریر می نگاشت۔ در ایام جمعہ بعد از نماز در مقصورۂ مسجد جامع ہرات وعظ در کمال تاثیر می گفت و درر غرر معانی آیات و احادیث را بہ لباس طبع لطیف می سُفت باعاظم امرا و نوئینان کہ در مجلس وعظ می نشستند ملتفت نمی گشت و در وقت نصیحت آن طائفہ سخنان درشت بر زبانش میگذشت و آن جناب بعد از فوت برادر بموجب تکلیف خاقان والا گہر مدت یک سال صاحب قضا بود۔ آنگاہ ترک آن امر دادہ، ہرچند دیگر مبالغہ نمودند قبول نفرمود، از آثار قلم لطافت نگار مولانا معین الدین معارج النبوۃ

---

[1] بحوالہ مقالات شیرانی ج ۶، طبع اول دسمبر ۱۹۷۲، مجلس ترقی ادب لاہور ص ۵۹۲

درمیان مردم مشہور است واکثر وقائع وحالات سید کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ و
اکمل التحیات بروایات مختلفہ درآن مسطور ومولانا معین الدین از شہور سبع وتسعمایہ
مریض شدہ درگذشت ودرمزار مقرب حضرت باری خواجہ عبداللہ انصاری پہلوی
برادر خود قاضی نظام الدین مدفون گشت[1] "

(مولانا معین الدین الفراہی، قاضی نظام الدین کے بڑے بھائی تھے۔ وہ بہت سارے فضائل اور کمالات سے اپنی واقفیت کا اظہار کرتے۔ زہد اور تقویٰ میں اعلیٰ درجات کے حامل تھے اور اکثر خطوط (ثلث، تعلیق، نسخ وغیرہ) کو انتہائی خوبی کے ساتھ تحریر کے صفحات پر لکھتے۔ جمعہ کے دنوں میں نماز جمعہ کے بعد ہرات کی جامع مسجد کے مقصورہ (امام کی مخصوص جگہ) میں انتہائی موثر وعظ کہتے اور قرآن وحدیث کے معانی کو صنایع وبدائع کے موتیوں سے لطیف طبیعت کے لباس میں پروتے۔ بڑے بڑے امراء اور شاہزادے جو اُن کی وعظ کی مجلسوں میں بیٹھتے، وہ اُن کی طرف مطلق التفات نہ کرتے، اُس گروہ کو نصیحت کرتے وقت ان کی زبان پر درشت الفاظ آتے۔ وہ اپنے بھائی کی وفات کے بعد عالی نسب خاقان (اشارہ ہے سلطان حسین بایقرا کی طرف) کے ارشاد کے بموجب ایک برس تک قاضی رہے، اُس کے بعد اُس کام کو چھوڑ دیا، دوبارہ ہر چند اُن سے اصرار کیا گیا انھوں نے قبول نہ کیا۔ مولانا معین الدین کے لطافت نگار قلم کی یادگار 'معارج النبوت' کی لوگوں کے درمیان شہرت ہے اس میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر حالات اور واقعات مختلف روایتوں کے ذریعہ لکھے گئے ہیں۔ ۹۰۷ھ میں بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے مقرب حضرت عبداللہ انصاری کے مقبرے میں اپنے بھائی قاضی نظام الدین کے پہلو میں دفن ہوئے)

حبیب السیر کے درج بالا بیان سے کئی باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں اول تو یہ کہ زہد وتقویٰ کے باوصف وہ ایک اعلیٰ پایہ کے خطاط بھی تھے مزید برآں قرآن

---

[1] بحوالہ مقالات شیرانی ج ۶، طبع اول، دسمبر ۱۹۷۲، مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۸۳

و حدیث کے ایسے برجستہ عالم کہ دوران وعظ کلام پاک کی آیتوں اور حدیثوں کے معانی بیان کر کے اپنی باتیں لوگوں کے دل نشین کیا کرتے۔ اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آزادہ رو انسان تھے اور سرکاری چاکری کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اس لیے ایک سال سے زیادہ منصب قضا پر کام نہ کر سکے۔ اُن کی دنیا سے بے رغبتی کا عالم یہ تھا کہ وہ حصولِ دنیا کا اولین زینہ یعنی امرا اور صاحبانِ ثروت کی صحبت سے نفور تھے اور ایسے جو بھی افراد اُن کی مجلس وعظ میں شریک ہوتے ان کی طرف ملتفت نہ ہوتے۔ غیاث الدین خواندمیر نے اُن کے خطاط ہونے کا جو ذکر کیا ہے اُس میں وہ منفرد نہیں ہیں۔ اُن کے بعد کی ایک فارسی کتاب جس کے زمانۂ تصنیف کا تخمینہ ۹۶۹ھ لگایا گیا ہے، رسالۂ قوانین خطوط اُن کے بیان کی تائید کرتی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ فارسی کتاب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی کوشش سے منظرِ عام پر آچکی ہے۔ ہم اس کتاب میں درج فارسی عبارت کو مقالات شیرانی جلد ششم کے حاشیے سے نقل کر رہے ہیں[1]۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ مقالات شیرانی کی تمام جلدوں کے گرانقدر حواشی اُن کے لائق پوتے اور ایک طرح سے علمی جانشین مظہر محمود شیرانی کے مرتب کردہ ہیں۔ رسالہ قوانین خطوط کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> "و از خوش نویسانِ خراسان مولانا معین الدین فراہی است کہ اکثر خطوط را در غایت جودت بر صفحۂ تحریر می نگاشت و در فضایل و کمالات درجۂ علیا داشت از آثار اقلام او معارج النبوت و تفسیر سورۂ فاتحہ و تفسیر سورۂ یوسف است در شہور سابع و تسع مائۃ در ہرات وفات نمود در مزار خواجہ عبداللہ انصاری مدفون گشت"
>
> (خراسان کے خوش نویسوں میں مولانا معین الدین فراہی (بھی) ہیں جو کہ اکثر خطوں کو انتہائی خوبی کے ساتھ صفحۂ تحریر پر لکھتے تھے اور فضائل اور کمالات میں بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کی قلمی یادگاروں میں معارج النبوت، تفسیر سورۂ فاتحہ اور تفسیر سورۂ یوسف ہیں ۹۰۷ھ میں ہرات میں وفات پائی اور خواجہ عبداللہ انصاری کے مقبرہ میں دفن ہوئے)

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۶۲۶۔

درج بالا بیان میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو 'حبیب السیر' میں کہی جا چکی ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ رسالہ 'قوانین خطوط' کے مصنف کے سامنے حبیب السیر کا کوئی نسخہ ضرور رہا ہوگا۔ اس گمان کی وجہ دونوں عبارتوں کی حیرت انگیز مماثلت ہے علاوہ بریں یہ بات خاص طور سے نظر میں رکھنے کی ہے کہ " اسرارالفاتحہ " کو تفسیر سورۂ فاتحہ اور حدایق الحقائق کو تفسیر سورۂ یوسف لکھا گیا ہے اُن کو اُن کے اصلی نام سے یاد نہیں کیا گیا ہے۔ تعجب ہے کہ مصنف کے انتقال کے باسٹھ برس بعد جو کتاب لکھی جائے اُس میں اُس کی کتابوں کے پورے نام تک نہ درج کیے جائیں۔ رسالۂ قوانین خطوط کے لکھے جانے کے بیس برس بعد ۹۸۹ھ میں ایک اور رسالہ ریحان نستعلیق تصنیف ہوا تھا جس میں وہی تمام باتیں دہرائی گئی ہیں جو رسالہ قوانین خطوط میں لکھی جا چکی ہیں۔ صرف معین الدین فراہی ہروی کی ایک اور کتاب " قصۂ موسیٰ " (اعجاز موسوی) کا نام ضرور اس میں زیادہ ہے[۱]

اب ہم معین الدین فراہی ہروی کے ایک خُرد معاصر محمد بن المبارک قزوینی کے اُس بیان پر نظر ڈالتے ہیں جو انھوں نے اپنے ترجمۂ 'مجالس النفائس' میں اپنی طرف سے لکھی ہیں۔ ابھی تک کے تمام معلوم مآخذ سے محمد بن المبارک قزوینی کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی ہے اور وہ اپنی رائے میں منفرد نظر آتے ہیں مگر صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنی رائے اور بیان میں منفرد ہیں اُن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہم کو معین الدین فراہی ہروی کے علمی کاموں کا جائزہ لیتے وقت اس بیان کو بھی منظر رکھنا چاہیئے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ محمد بن المبارک قزوینی کا بیان کس حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے اپنے مقالے میں قزوینی کے بیان کا اردو ترجمہ درج کر دیا ہے۔ جس کو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں :

> " مولانا معین، واعظ مولانا محمد فرہی (فراہی) کا بیٹا ہے۔ یہ بھی اچھا واعظ ہے اور تمام خراسان میں اُس کا وعظ خاص وعام میں مقبول ہے لیکن یہ دیوانہ سا ہے اور اُس کے مرید بھی ایسے ہی ہیں

---

[۱] ریحان نستعلیق کا بیان مقالات شیرانی جلد ۲ کے ص ۶۲۶ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

چونکہ لوگ اسے دیوانہ سمجھتے ہیں اس لیے جو جی میں آتا ہے منبر پر کہہ دیتا ہے اور کوئی اُس سے باز پرس نہیں کرتا اور کرے بھی کیوں جب کہ دیوانہ اور عاشق مواخذے سے بری ہیں۔ ایک روز اُس نے منبر پر یہ کہہ دیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایمان تقلیدی ہے اور اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ وہ حضرت امیر کے اس قول "لو کشف الغطاء ما ازددت یقینا" (اگر پردہ ہٹا دیا جائے تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا) کا مفہوم درست طور پر نہیں سمجھا۔ دیوانگی کے عذر کی بنا پر لوگوں کے مواخذے سے تو بچا رہا لیکن خدائے تعالیٰ نے اسے معذور نہ سمجھا اور ایسے شکنجے میں گرفتار کیا کہ لوگ دیکھ کر دم بخود رہ گئے اور کہنے لگے کہ اگرچہ انھوں نے کوئی گرفت نہیں کی لیکن خدا تعالیٰ نے اُس کو گستاخی کی سزا دی۔ مولانا نظام الدین ایک قابل جوان ہے لیکن منبر کے تختے نے اُس کی قابلیت کو ضائع کر دیا ہے۔ یہ مطلع مُلّا کا کہا ہے:

مگر فصل بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد
مگر وصل نگار آمد کہ دل با وصل ہمدم شد[۱]

یہاں پر ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ ابھی تک کے معلوم ماخذوں میں سے کسی ایک میں بھی معین الدین فراہی ہروی کا سال ولادت تحریر نہیں کیا گیا ہے، البتہ اُن کا سال وفات زیادہ تر ۹۰۷ھ بیان کیا گیا ہے، ڈاکٹر سید جعفر سجادی نے ۹۰۸ھ لکھا ہے مگر اپنا ماخذ نہیں تحریر کیا ہے[۲] اگر یہ مان لیا جائے کہ انتقال کے وقت معین الدین فراہی ہروی کی عمر ساٹھ برس تھی تو اُن کی پیدائش ۸۴۷ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔

غیاث الدین خواند میر کا سال ولادت لگ بھگ ۸۸۰ھ اور مولد ہرات

---

[۱] بحوالہ مقالات شیرانی ج ۶ ص ۵۹۳
[۲] حدائق الحقائق طبع سوم، تہران، ۱۳۶۴ھ ش (۱۹۸۵ء) ص ۱۲

بتلایا گیا ہے یعنی اُن کے اور معین الدین فراہی ہروی کے درمیان تینتیس سال کی چھوٹائی بڑائی تھی اس حساب سے ۹۰۷ھ میں جب معین الدین نے اس دنیا کو خیرباد کہا تھا اُس وقت خواندمیر ستائیس اٹھائیس برس کے عاقل و بالغ جوان ہو چکے ہوں گے اور چونکہ دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ غیاث الدین خواندمیر، اپنے بزرگ معاصر سے واقف رہے ہوں گے اور انھوں نے معین الدین فراہی ہروی کے انتقال کے بائیس تیئس سال بعد حبیب السیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کی ذاتی معلومات پر مبنی ہوگا۔ حبیب السیر کی ابتدا ۹۲۷ھ میں اور تکمیل ۹۳۰ھ میں ہوئی تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دو ہم عصروں غیاث الدین خواندمیر اور محمد بن المبارک قزوینی کے بیانات میں اتنا بعد کیوں ہے؟ یہ الجھن اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ محمد بن المبارک قزوینی کی کتاب خواندمیر کی کتاب سے ایک سال پہلے ۹۲۹ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔

معین الدین فراہی ہروی کی شخصیت کے بارے میں ہم کو جو کچھ علم ہو سکا وہ درج بالا سطور میں پیش کر دیا گیا۔ اب ایک نظر اُن کے زمانۂ حیات پر بھی ڈال لینی چاہیے تاکہ اُن کی تفسیر کا جو انداز بیان ہے اور جو جو موضوعات وہ زیر بحث لائے ہیں۔ اُن کو سمجھنا اور اُن کی قدر و قیمت متعین کرنا ہمارے لیے آسان ہو سکے۔

نویں صدی ہجری کے نصف آخر کا حصہ تیموریوں کے گر گر کر سنبھلنے کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہمارا یہ گمان درست ہے کہ معین الدین فراہی ہروی ۸۴۷ھ یا اس کے آس پاس کے کسی سنہ میں پیدا ہوئے ہوں گے تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اُن کی ولادت تیمور کے بیٹے اور اُن کے ہم نام معین الدین شاہ رخ کے انتقال (۸۵۰ھ) کے دو تین سال قبل ہوئی ہوگی۔ شاہ رخ کے ایک بیٹے میرزا غیاث الدین بایسنقر، معین الدین فراہی ہروی کی ولادت سے پہلے ہی اپنے والد کی زندگی میں ۸۳۷ھ میں اس دنیا سے کوچ کر چکا تھا۔ اس لیے معین الدین فراہی ہروی نے جب ہوش کی آنکھیں کھولی ہوں گی تو وہ زمانہ الغ بیگ کے عہد حکومت کا رہا ہوگا۔ ابھی وہ چھ برس کے قریب کے ہوئے ہی ہوں گے کہ ۸۵۳ھ میں الغ بیگ کے قتل کی خبر اُن کے کانوں میں پڑی ہوگی جس کو خود اُس کے بیٹے عبد اللطیف نے قتل کروا ڈالا تھا۔

قسمت کی ستم ظریفی قابلِ ذکر ہے کہ چھ ہی ماہ کے بعد ۸۵۴ھ میں الغ بیگ کا "سعادت مند" بیٹا عبد اللطیف خود مقتولوں کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد تیمور کے پڑپوتے اور جلال الدین میرانشاہ کے پوتے، ابوسعید بن سلطان محمد میرزا ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا اور ۸۷۳ھ تک حکمرانی کرتا رہا۔ جس وقت ابوسعید نے دنیا سے کوچ کیا اُس وقت معین الدین فراہی ہروی پچیس چھبیس برس کے فارغ التعلیم نوجوان رہے ہوں گے۔ کیا عجب ہے کہ اُس زمانے میں اُن کی وعظ گوئی کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہو اور تصنیف و تالیف کا بھی۔

معین الدین فراہی ہروی کی فعال اور متحرک زندگی کے بیشتر ایام سلطان حسین میرزای بایقرا کے عہدِ حکومت (۸۷۵ - ۹۱۱ھ) میں گذرے انھوں نے ۹۰۷ھ میں اس دنیا کو اُس وقت خیر باد کہا جب تیموریوں کی شان و شوکت کا سورج ڈوبنے کے قریب تھا ایک طرف صفویوں کی قوت و طاقت آندھی طوفان کی رفتار سے اپنے گرد و پیش کو لپیٹ میں لے رہی تھی تو دوسری طرف اُزبک اپنی قوت بازو کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قرب و جوار کی سرزمین کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے کوشاں تھے۔ سلطان حسین میرزای بایقرا کے عہدِ حکومت تک تیموریوں کا اقتدار برقرار رہا مگر اُس کے اخلاف اُس کی چھوڑی ہوئی سلطنت کو برقرار نہ رکھ سکے اور اُس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جس کی بنیاد تیمور نے رکھی تھی۔

معین الدین فراہی ہروی کے عہدِ حیات میں یوں تو تصوف کے سب ہی دبستان اپنے اپنے طور پر فعال و سرگرم تھے۔ مگر تین شیعہ دبستانوں نے اُس زمانے میں خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ ہمارا اشارہ سلسلۂ صفویہ، سلسلۂ نعمت اللہیہ اور سلسلۂ نوربخشیہ کی طرف ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سلسلۂ نوربخشیہ کے مؤسس سید محمد نوربخش قاینی خراسانی کا سالِ وفات ۸۶۹ھ ہے جب کہ معین الدین فراہی ہروی بیس اکیس برس کے ہو چکے ہوں گے اور نوربخش کے مذہبی افکار سے کچھ نہ کچھ آگاہ بھی ہوں گے۔ اگرچہ وہ اپنی تحریروں میں اہلِ سنت والجماعت کے ایک راسخ العقیدہ پیرو نظر آتے ہیں مگر ایک خلش دل میں ہوتی ہے کہ محمد بن المبارک قزوینی نے اپنے ترجمۂ مجالس النفائس میں اُن کی مخصوص مزاجی کیفیت کی طرف جو

اشارہ کیا ہے وہ کسی اور چیز کی تو غمازی نہیں کرتی ؟ اِس خلش کے تحت یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معین الدین فراہی ہروی کی تحریروں کا اِس نقطۂ نظر سے بھی مطالعہ کیا جائے کہ وہ نوربخشیہ دبستان تصوف کے افکار و نظریات سے کس حد تک متاثر ہوئے ہیں ؟ امید ہے کہ فارسی ادب کا کوئی طالب علم اس طرف بھی توجہ کرے گا۔

معین الدین فراہی ہروی کو یہ شرف حاصل ہے کہ جامی (۸۱۷ - ۸۹۸ھ) علی شیر نوائی (۸۴۴ - ۹۰۶ھ) اور میر خواند (۸۳۷-۹۰۳ھ) جیسے عبقری اُن کے ہم عصر تھے۔ حبیب السیر میں جس انداز سے اُن کی وعظ گوئی کا تذکرہ کیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے مشہور ترین واعظ رہے ہوں گے اور ان کی تصانیف سے بھی پڑھا لکھا طبقہ عام طور سے واقف رہا ہوگا۔ خدا جانے کیوں بعد کے تذکرہ نگاروں نے معین الدین فراہی ہروی کا نہ تو شاعر کی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور نہ ہی نثر نگار کی حیثیت سے۔ ہمارے زمانے کے مشہور ایرانی مورخ ادبیات ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے نہ تو اُن کی شاعری کو قابلِ اعتنا سمجھا ہے اور نہ ہی نثر نگاری کو۔ اگرچہ صاحبِ موصوف معین الدین فراہی ہروی کی دو کتابوں "قصہ موسٰی"[1] یا "معجزات موسوی" اور "داستانِ یوسف و زلیخا"[2] سے واقف ہیں مگر غالباً یہ کتابیں ان کے نزدیک اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کا تفصیلی جائزہ لیا جائے[3]۔

---

[1] اس کتاب کا اصل نام اعجاز موسوی ہے۔ ۱۲۷۲ھ میں عمدۃ المطابع نے اس کو شایع بھی کیا ہے اور اسی کا ایک نسخہ میرے پیش نظر ہے۔ اس مطبوعہ نسخے کی بعض عبارتوں اور ترقیمے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب معین الدین فراہی ہروی متوفی ۹۰۷ھ کی تحریر کردہ تو ہے مرتب کردہ نہیں ہے۔ ممکن ہے اُن کا کوئی لڑکا ان کا ہم نام ہو اور اُس نے اُن کے "وعظ" کو موجودہ شکل میں ۹۴۰ھ میں مرتب کیا ہو۔ مطبوعہ نسخے کے ترقیمے میں تحریر ہے " فی غرۃ صفر ختم لہ بالخیر والظفر سنۃ اربعین وتسعاتہ (تسعمأۃ؟) من الہجرۃ النبویۃ علیہ الصلوٰۃ"

[2] معین الدین ہروی فراہی نے اِس کا نام "حدائق الحقائق فی کشف الاسرار الدقائق"، رکھا ہے معلوم ہوتا ہے یہ کتاب صفا صاحب کی نظر سے نہیں گذری ہے۔

[3] تاریخ ادبیات در ایران ج ۴، ص ۷۰۴۔

اِن ابتدائی باتوں کے بعد اب ہم اُن کی تفسیر سورۂ فاتحہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ اِس تفسیر کا نام خود مفسر نے اسرار الفاتحہ رکھا ہے اور ہندوستان میں اِسی نام سے نولکشور پریس لکھنؤ نے اس کو ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۸ء میں شائع کیا ہے۔ ناشر نے خاتمہ الطبع میں لکھا ہے کہ اِس "جنس کمیاب" اور "گوہر نایاب" کی تلاش میں جو "طالبان" تھے وہ اپنی سعی وجستجو سے مایوس ہو چکے تھے۔ اُسی عالم میں بہ ہزار دقت وجستجو اِس کا ایک نسخہ پیشاور کے علماء کے پاس سے حاصل ہوا اُسی مخطوطے سے اِس مطبوعہ نسخے کی کتابت کروا کر اِس کو شائع کیا گیا۔ اس خاتمہ الطبع سے اِس بات کا علم ہوتا ہے کہ نولکشوری مطبوعہ متن موجودہ زمانے کی روش کے مطابق مرتب نہیں کیا گیا ہے بلکہ کاتب نے جو کچھ اور جس طرح مخطوطے کو لکھا تھا اُس کو من وعن شائع کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے کاتب کی وہ تمام سہو وخطا بھی متن کا ایک حصہ بن گئی ہے جو کتابت کے دوران اُس سے سرزد ہوئی تھی۔ یہ تفسیر "۸×"۱۱ کے سائز کے ۵۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ صرف اِس ضخامت ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سات آیتوں کی جو تفسیر ۵۳۲ صفحات میں لکھی جائے گی اُس میں کیا کچھ نہ ہوگا۔

ایک اہم بات اِس تفسیر کی یہ بھی ہے کہ یہ مخلوط زبان میں لکھی گئی ہے یعنی اِس کا تقریباً نصف حصہ عربی میں ہے اور نصف فارسی میں۔ اس مخلوط زبان کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نویں صدی ہجری کے نصف آخر کے حصے میں ہرات اور نواح ہرات میں عربی زبان جاننے اور پڑھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد رہی ہوگی اور اس زمانے میں بھی ہرات جیسے عجمی علاقے میں عربی کو علمی زبان کی حیثیت حاصل ہوگی ورنہ معین الدین فراہی ہروی اِس "سعی لاحاصل" کے مرتکب کیوں ہوتے؟ اِسی مخلوط زبان کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان ہو یا ایران "اسرار الفاتحہ" سے مستفید ہونے والوں کی تعداد "حدائق الحقائق" سے مستفید ہونے والوں کی تعداد سے کہیں کم ہے۔

معین الدین فراہی ہروی کے قول کے مطابق یہ کتاب ایک مقدمہ پندرہ مجلسوں پر مشتمل ہے اور ہر مجلس پندرہ فصلوں پر اور ہر فصل میں لطائف اور اسرار

بیان کیے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر کی ابتدا میں تمام مجلسوں اور فصلوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جن کو پورا کا پورا نقل کرنا نہ ضروری ہے اور نہ ہی مفید اس لیے ہم ان کی تحریر کردہ تفصیل کا ابتدائی اور آخری حصہ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس کے مطالعے سے انداز ہو جائے گا کہ انھوں نے اس تفسیر میں کیا کیا لکھا ہے۔ یہاں اس بات کی بھی یاد دہانی ضروری ہے کہ اِس تفسیر سورۂ فاتحہ کا نام "اسرارالفاتحہ" خود مفسر کا رکھا ہوا ہے۔

مقدمہ سورۂ فاتحہ کے فضائل پر مشتمل ہے۔ اس میں تین فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں وہ احادیث اور اخبار نقل کیے گئے ہیں جو اس کے فضائل میں وارد ہوئے ہیں۔ اِسی طرح اس میں آثار صحابہ و تابعین بھی مذکور ہیں۔ احادیث کی مجموعی تعداد بائیس اور آثار کی سات ہے۔ دوسری فصل میں وہ اشارات بیان کیے گئے ہیں جو مفسر کے نزدیک اس سورہ میں مذکور ہیں، جن کی تعداد اٹھارہ ہے۔ پہلے اشارے میں مزید دوسرے سات اشارے اور ساتویں میں سات احکام بیان کیے گئے ہیں۔ تیسری فصل اس سورہ کے اسرار و رموز کے بیان پر مشتمل ہے جن کی تعداد دس ہے اور اِن میں پانچ لطائف بھی مذکور ہیں۔

معین الدین فراہی ہروی نے مقدمہ کی دوسری فصل کے دسویں اشارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کے مطالعہ سے ہم اپنے تحلیل و تجزیہ کا آغاز کرتے ہیں[1]:

> "بعضی از اہل اشارت از روی بشارت در تعداد حروف تعیین کلمات این سورۂ کریمہ چنین ایراد فرمودہ اند کہ الحمد پنج حروف اشارت بہ پنج نماز تواند بود تا ہر کہ الحمد برخواند تدارکِ تقصیراتِ پنج وقتِ نماز او گردد۔ للہ سہ حرف است، سہ را با پنج ضم کنی ہشت شود، بکلمۂ الحمد للہ مستحق در آمدنِ ہشت بہشت گردد۔ رب العالمین دہ حرفت ، دہ را با ہشت ضم کنی ہژدہ شود عالمہا ہژدہ ہزار است، خوانندۂ این ہژدہ حرف را ثواب بشمار ہژدہ ہزار عالم باشد۔ الرحمن شش حرف است با ہژدہ ضم کنی بیست و چہار می شود

---

[1] ص ۲۳-۲۴

شبانہ روزی بیست وچہار ساعت است ہر کہ این حروف را با اعتقاد تمام بگوید کفارتِ گناہانِ بیست وچہار ساعتِ شبانہ روزیٔ وی گردد۔ الرحیم شش حرف دیگر است، شش را با بیست وچہار ضم کنی سی شود و ہر ماہی سی روز است تکلم باین کلمات سبب مغفرتِ گناہان سی روزۂ او گردد۔ مالک یوم الدین دوازدہ حرف و سالی دوازدہ ماہ، خوانندۂ این آیت اصلاح دوازدہ ماہ سالی نمودہ باشد، ایاک نعبد ہشت حرف است و ماقبل چہل و دو مجموع پنجاہ شود و مقدار روز قیامت پنجاہ ہزار سال است حق تعالیٰ خوانندۂ این پنجاہ حرف را از عقبات آن پنجاہ ہزار سال بسلامت بگذراند و ایاک نستعین یازدہ حرف است با حروف ما تقدم شصت و یکی باشد و شمار دریا با شصت و یکی است"

(اہلِ اشارت میں سے بعض نے بشارت کے ذریعے اس سورۂ کریمہ کے حروف کی تعداد کے تعین کے لیے یوں ارشاد فرمایا ہے کہ الحمد کے پانچ حرف پانچ نمازوں کی طرف اشارہ ہو سکتے ہیں کیونکہ جو شخص بھی الحمد پڑھتا ہے اس کی پانچوں وقتوں کی نمازوں کی غلطیوں کا تدارک ہو جاتا ہے۔ للہ کے تین حرف ہیں، تین کو پانچ میں جوڑ دو تو آٹھ ہو جاتا ہے کلمۂ الحمدللہ (کہنے) کی وجہ سے وہ (شخص) ہشت بہشت میں داخل ہونے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ رب العالمین دس حرف ہے۔ دس کو آٹھ میں جوڑ دو تو اٹھارہ ہو جاتا ہے۔ عالموں کی تعداد اٹھارہ ہزار ہے۔ ان اٹھارہ حرفوں کے پڑھنے والے کو اٹھارہ ہزار عالموں کے برابر ثواب ملتا ہے۔ الرحمٰن کے چھ حروف ہیں۔ اِن کو اٹھارہ میں جوڑ دو تو چوبیس ہو جاتے ہیں، دن اور رات کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں جو شخص بھی پورے اعتقاد کے ساتھ ان حروف کو کہتا ہے اس کے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کے اندر سرزد ہونے والے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے۔ الرحیم کے دوسرے چھ حرف ہیں۔ چھ کو چوبیس سے جوڑ دو تو تیس ہو جاتے ہیں اور ہر مہینہ تیس دن کا ہوتا ہے۔ اِن حرفوں کو ادا کرنا اُس کے تیس دنوں کے (کیے ہوئے) گناہوں کے عذاب سے نجات کا سبب بنتا ہے۔ مالک یوم الدین کے بارہ حروف ہیں اور ایک سال بارہ مہینوں کا، اِس آیت کے پڑھنے والے کو سال کے بارہ مہینوں

(میں) بھلائی دکھائی جاتی ہے۔ ایاک نعبد کے آٹھ حروف ہیں، پہلے کے بائیس حروف، ان کا مجموعہ پچاس ہوتا ہے اور قیامت کے دن کی درازی پچاس ہزار سال ہے۔ حق تعالیٰ ان پچاس حرفوں کے پڑھنے والے کو اُن پچاس ہزار سال کے عذابوں سے سلامتی کے ساتھ گزارد ے گا۔ وایاک نستعین میں گیارہ حرف ہیں۔ پہلے کے حروف (کی تعداد) کے ساتھ یہ اکسٹھ ہو جاتے ہیں۔ سمندروں کی تعداد بھی اکسٹھ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کلمات کے پڑھنے والے کے نامۂ اعمال میں سمندروں کے قطروں کی تعداد کے برابر نیکیاں لکھ دیتے ہیں اور گناہوں سے درگذر کرتے ہیں۔)

"اہدنا الصراط یازدہ حرف ست باشصت ویکی ہفتاد ودو باشد و تعدادِ فرق این امت ہفتاد و دو است کہ درگوئی بدعت وضلالت گمراہ گشتہ اند حق تعالیٰ خوانندۂ این حروف را از نکبات وضلالاتِ این فرقہ بانگاہ دارد و بجادۂ استقامتِ فرقۂ اہلِ سنت وجماعت مشرف کند۔ المستقیم ہشت حرف است با ہفتاد و دو ہشتاد شود، وحدقذف ہشتاد تازیانہ است حق تعالےٰ خوانندۂ این حروف را از جنایت وحدود آن بکمالِ عنایت مصوُن ومحفوظ دارد صراط الذین انعمت علیہم نوزدہ حرف است، نوزدہ با ہشتاد نود و نُہ باشد و حق تعالیٰ را نود و نُہ نام است، خوانندۂ این حروف ثواب این نامہا ی نود و نُہ نام یا بد و ببرکت احصای آن مستوجب داخلِ جنت گردد۔ غیر المغضوب علیہم پانزدہ حرف است با نود و نُہ صد و چہاردہ می شود ثواب تلاوت صد و چہاردہ سورۂ قرآن یابد۔ ولا الضالین دہ حرف است با صد و چہاردہ صد و بیست و چہار گردد۔ حق تعالیٰ صد و بیست و چہار ہزار پیغمبر برخلق فرستادہ خوانندۂ این سورۃ ثواب متابعت ہمہ انبیا بیابد و بدولت شفاعت ایشان مشرف گردد۔ آمین چہار حرف است خوانندۂ این چہار حرف بچہار کرامت مخصوص گردد اول در دم آخر از سلب ایمان نجات یابد، دوم از سکرات مرگ محفوظ باشد سوم جواب منکر و نکیر بصواب بگوید۔ چہارم حساب بروی آسان گردد از صراطش بسلامت بگذراند و در بہشت در آرد و بہ لقای خویش مشرف گرداند"

(اہدنا الصراط میں گیارہ حروف ہیں۔ اکسٹھ سے مل کر (یہ عدد) بہتر ہو جاتا ہے اور اِس امت کے اُن فرقوں کی بھی تعداد بہتّر ہے جو بدعت اور ضلالت کے کوچے میں آ کر اپنی راہ گم کر بیٹھے ہیں۔ حق تعالیٰ اِن حروف کے پڑھنے والے کی ان فرقوں کی بدبختیوں اور ضلالتوں سے حفاظت کرتا ہے اور انھیں اہل سنت والجماعت کے استقامت کے راستے (پر چلنے) سے شرف یاب کرتا ہے۔ المستقیم کے آٹھ حروف ہیں جو بہتّر سے مل کر اسّی ہو جاتے ہیں۔ قذف (کسی خاتون کے کردار پر بہتان تراشی) کی حد (سزا) اسّی کوڑے ہیں۔ حق تعالیٰ اپنے کمالِ عنایت سے اِن حروف کی تلاوت کرنے والے کو قذف کے جرم اور اس جرم کی سزا سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔ صراط الذین انعمت علیہم انیس حروف ہیں۔ اُنیس، اَسّی سے مل کر ننانوے ہو جاتے ہیں اور حق تعالیٰ کے نام ننانوے ہیں۔ اِن حروف کی تلاوت کرنے والا اُن ننانوے ناموں کو پڑھنے (کے برابر) ثواب پاتا ہے اور اِن کے ورد سے جنت میں داخل ہونے کا اہل ہو جاتا ہے۔ غیر المغضوب علیہم، پندرہ حروف ہیں ننانوے سے مل کر یہ ایک سو چودہ ہو جاتے ہیں (اِن حروف کو پڑھنے والا) قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں کی تلاوت کے برابر ثواب پاتا ہے۔ ولا الضالین دس حروف ہیں، ایک سو چودہ سے مل کر ایک سو چوبیس ہو جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے خلق پر ایک سو چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ اس سورہ کو پڑھنے والا جملہ انبیاء کی پیروی کرنے کے برابر ثواب پاتا ہے اور اُن کی شفاعت کی دولت سے مشرف ہوتا ہے۔ آمین کے چار حرف ہیں، اِن کا پڑھنے والا چار انعامات کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے۔ اول تو یہ کہ دمِ آخر ایمان کے سلب ہونے سے نجات پاتا ہے۔ (یعنی اُس کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے) دوسرے یہ کہ سکرات سے محفوظ رہتا ہے تیسرے یہ کہ منکر نکیر کے سوالات کے جوابات صحیح دیتا ہے چوتھے یہ کہ اس کے لیے (روز قیامت کا) حساب کتاب آسان ہو جاتا ہے اللہ اس کو سلامتی کے ساتھ صراط سے گذار دیتا ہے اور جنت میں لے آتا ہے اور اُس کو اپنے دیدار سے مشرف کرتا ہے)

معین الدین فراہی ہروی کی ایک مسلسل تحریر کو اپنی اور قارئین کی آسانی کے لیے ہم نے دو حصوں میں تقسیم کر کے نقل کیا ہے۔ اردو اور فارسی کی قدیم تحریروں کا ایک بڑا نقص "قدما کہتے ہیں" "مورخین نے بیان کیا ہے"، "مفسروں نے لکھا ہے" "فقہا، کا خیال ہے" جیسے فقروں کا اندھا دھند استعمال ہے جن کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہوتا کہ کیا واقعی قدما، مفسرین یا فقہا نے وہی کہا ہے جو بیان کیا جا رہا ہے یا لکھنے والا یہ حوالے دے کر اپنے قاری کو مرعوب کر رہا ہے۔ معین الدین فراہی ہروی کی تحریریں بھی اس نقص سے خالی نہیں ہیں۔ اس اقتباس کے شروع میں انھوں نے جن "اہل اشارت" کا ذکر کیا ہے اُن کے بارے میں ہم کو یہ قطعی علم نہیں ہے کہ یہ کون لوگ تھے، دیوانے تھے یا کھسکے ہوئے، فاتر العقل یا کسی مخصوص جذبے کے اسیر، اہل صحو میں تھے یا اہل سُکر میں۔ طبعی (Normal) طور کے انسان تھے یا نقطۂ اعتدال سے ہٹے (Abnormal) ہوئے؟ جب "اہل اشارت" کے بارے میں ہمارے علم میں کچھ ہے ہی نہیں تو ہم اُن کی "بشارت" کو واقعی اور حقیقی بشارت کیسے سمجھیں؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ معین الدین فراہی ہروی جس بات کو بشارت سمجھے ہیں وہ کوئی شیطانی دغدغہ ہو یا وسوسہ۔ اِن تمام باتوں سے قطع نظر درج بالا اقتباسات سے اس بات کا ضرور ثبوت مل جاتا ہے کہ معین الدین فراہی ہروی "دور کی کوڑی" لانے کے فن میں ماہر تھے ان کا حساب پختہ اور ذہن اتنا حاضر تھا کہ حروف کے اعداد کا سلسلہ عقاید کے کسی نہ کسی ایسے گوشے سے ملا دیتے ہیں کہ عقل اُن کی "ذہانت" پر حیران ہو کر رہ جاتی ہے۔ جہاں چاہتے ہیں ہزار کے عدد کا اضافہ کر دیتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں ماہ و سال کی گردش کا ذکر فرما دیتے ہیں، جہاں موقع ملتا ہے ساعتوں کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ غرض کہ وہ اپنی بات کو اس طرح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کا قاری کچھ دیر کے لیے تو دھوکے میں پڑ ہی جائے۔

درج بالا اقتباس کو پڑھنے سے ایک گمان یہ بھی ہوتا ہے کہ معین الدین فراہی ہروی شاید رویت باری تعالیٰ کے قائل تھے۔ ہمارے اس گمان کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے آمین کہنے کی "کرامات" کا ذکر کرتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے کہ آمین

کہنے والے بندے کو اللہ اپنے دیدار سے مشرف فرماتا ہے۔ اس جملے سے تو یہی مطلب نکلتا ہے کہ آمین کہنے والا بندہ اپنی ظاہری آنکھوں سے قیامت کے دن باری تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوگا۔ نجانے کیسے معین الدین فراہی ہروی یہ تحریر کرنا فراموش کر گئے کہ آمین زور سے کہنا چاہیے یا دھیرے سے، اگر وہ اس بات کی بھی صراحت کر دیتے تو ہم کو اُن کے فقہی مسلک کا بھی علم ہوجاتا۔

اپنی اس تحریر میں معین الدین فراہی ہروی نے سمندروں کی تعداد اکسٹھ بتلائی ہے۔ ظاہر ہے اسرار الفاتحہ جغرافیہ کی نہیں تفسیر کی کتاب ہے اور اس سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ کوئی ٹھوس جغرافیائی علم ہم کو دے سکے گی مگر اس سے اتنی بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ نویں صدی ہجری کے اواخر کے پڑھے لکھے افراد کے نزدیک سمندروں کی تعداد اکسٹھ تھی۔ اس مسئلہ پر تو کوئی جغرافیہ داں ہی حتمی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کل سمندروں کی تعداد کتنی ہے۔ یہاں پر فارسی لفظ دریا غلط فہمی کا باعث بن رہا ہے۔ فارسی میں سمندر کے لیے بحر اور دریا دونوں الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ اکسٹھ کی تعداد کی وجہ سے ہم نے لفظ دریا کا ترجمہ سمندر کیا ہے کیونکہ اکسٹھ دریا تو ایک ہی ملک میں مل جائیں گے۔

علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت خروجِ دجّال بھی بتلائی جاتی ہے۔ یہ دجّال کون ہے؟ کہاں سے آئے گا؟ ماں کے پیٹ سے عام انسانوں کی طرح پیدا ہوگا یا کسی جنگل، بیابان یا پہاڑ کے غار سے دفعتًا نمودار ہوجائے گا، اِن باتوں کے بارے میں کسی کو کوئی حتمی علم نہیں ہے۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ اس کی شخصیت، جائے پیدائش، کردار، زمانۂ پیدائش وغیرہ کے بارے میں عہدِ اولین سے ہی علماء اور مفسرین میں اختلاف ہے۔ معین الدین فراہی ہروی نے مالک یوم الدین کی تفسیر لکھتے ہوئے جہاں علاماتِ قیامت کا ذکر کیا ہے وہیں خروجِ دجّال کے بارے میں ایک خاصہ طویل باب لکھا ہے۔ اس باب میں ایک نسبتًا طویل روایت ایسی نظر آئی جو ہماری نظر سے کسی اور جگہ نہیں گذری۔ ہم معین الدین فراہی ہروی کی اس روایت کو شاذ سمجھتے ہوئے نقل کر رہے ہیں۔ اس روایت کے مطالعے سے اس بات کا بھی علم ہوجاتا ہے کہ معین الدین فراہی ہروی کے عہدِ حیات

میں دجّال کے بارے میں ایسی بھی روایت موجود تھی ۔ یہ روایت مسلسل عبارت میں تحریر کی گئی ہے ہم اپنی اور قارئین کی آسانی کے لیے اس کو ٹکڑوں میں تقسیم کر رہے ہیں ۔ اس روایت کا عنوان یوں ہے:" درذکر ولادت او وکیفیت ملاقات او بحضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ودعای حضرت بدفع شراو"۔

"دراخبار چنین وارد گشتہ کہ دجّال ضال درایام دولت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم از مادر متولد شد۔ آوردہ اند کہ چون خواجہ علیہ السلام بمدینہ تشریف می فرمودند بہ مجتمع السال کہ مزرعۂ شعب بن حارث بود بدو سنگی مدینہ رسید، عنان مرکب باز کشید وفرمودیا ابابکر ولادت دجّال درین قریہ خواہد بود و نام پدر او سائد یہودی ست دبر وایت مصابیح صیا واسم مادر او کیابنہ وجہودان او راقطانہ خوانند وچہ آنحضرت بہ مدینہ نزدل فرمود وچہار شنبۂ ہمان ہفتہ وقت اصفرار شمس دجّال متولد شد وچون بزمین آمد درحال بنشست وبی اہمال سخن گفتن آغاز کرد وخود را یاد می کرد و زود از دُمی بالید وچشم راست وی چون دانۂ انگور کہ بر سرِ آب آید بیرون آمدو عین یسارِ وی خود ممسوخ بود وبروایتی آنکہ چشم راست وی ممسوخ وچشم چپ او سنر بیرون آمدہ ، این عجوبۂ انام را مادر دجّال نام کرد۔ پدر وی مسیح لقب نہادوکنیتش ابو یوسف مقرر گشت ودران وقت کہ دجّال قدم از نقطۂ عدم بخطۂ وجود آورد عبداللہ بن مسعود ومحمد بن سلمہ رضی اللہ عنہما بکفایت مہمی رفتہ بودند چون بہ مجتمع السال رسیدند آن جا فتنہ ہائل برخاستہ بود پرسیدند کہ این مشغلہ چیست ؟ گفتند امر غریبی بظہور پیوستہ پسری از مادر بزادہ وہمان ساعت پشت بہ دیوار باز نہادہ وروی بہ مردم آوردہ بہ ایشان سخن می گوید وخود را یاد می کند ، ابن مسعود ومحمد رضی اللہ عنہما چون این عجب بشنیدند بوثاق دجّال آمدند مادرش ایشان پیش وی راہ داد، ترکیب عجیب وہیت مہیب مشاہدہ کردند بر تختۂ پیشانی او بنقش صنع یزدانی نوشتہ کہ الکافر باللہ وبروایتی ک ف ر، این سہ حرف مقطع مثبت ساختہ پس از آنجا غمگین واندوہگین برخاستند ودل بریان وچشم گریان روی بہ مدینہ نہادند پیش از نماز خفتن بود کہ بحضرت سلطان السلاطین نبوت وبرہان خواقین فتوت صلی اللہ

علیہ وسلم حاضر آمدند و از ولادت دجّال وکیفیت احوال اورا اعلام دادند"
(روایتوں میں یوں آیا ہے کہ گمراہ دجّال دنیا کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ماں (کے پیٹ) سے پیدا ہوا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لا رہے تھے، مدینے سے دو سنگ میل قبل مجتمع السال کے مقام پر (اُس جگہ) پہونچے جہاں شعب بن حارث کی کھیتی باڑی تھی تو آپؐ نے اپنی سواری روک لی اور فرمایا، اے ابوبکر دجّال کی پیدائش اسی قریے میں ہوگی اس کے باپ کا نام سائد یہودی ہے۔ مصابیح کی روایت کے مطابق (دجّال کے باپ کا نام صیاد ہے) اور اُس کی ماں کا نام کیاہنہ اور اس کو یہود قطانہ کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن مدینے میں نزول فرمایا اُسی ہفتے کے بدھ کے دن سورج کے زرد پڑنے کے وقت دجّال پیدا ہوا۔ جب وہ (ماں کے پیٹ سے) زمین پر آیا فوراً ہی بیٹھ گیا اور روانی سے باتیں کرنی شروع کردیں[1] اور اپنا ذکر کرنے لگا جلد ہی اس کی ایک دم نکل آئی اور اس کی داہنی آنکھ انگور کے ایسے دانے کی طرح باہر نکل آئی جو کہ پانی کی سطح پر ہو اور اُس کی بائیں آنکھ بدہیت تھی اور ایک (دوسری) روایت کے مطابق اُس کی داہنی آنکھ بدہیت اور بائیں آنکھ ہرے رنگ کی باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس عجیب انسان کا نام ماں نے دجّال رکھا، باپ نے اس کو مسیح کا لقب دیا اور کنیت ابو یوسف قرار دی۔ اُس وقت جب کہ دجّال نے نقطۂ عدم سے خطۂ وجود میں قدم رکھا عبداللہ ابن مسعود اور محمد بن سلمہ رضی اللہ عنہما ایک مہم کو سر کرنے تشریف لے گئے تھے۔ جب وہ لوگ مجتمع السال پہونچے وہاں فتنۂ عظیم برپا تھا اُن حضرات نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا ایک عجیب وغریب بات ہوئی ہے۔ ماں کے پیٹ سے ایک لڑکا جس وقت پیدا ہوا اُسی وقت دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا ہے اور لوگوں کی طرف اپنا رخ کرکے

---

[1] یہ بات آریائی ذہن کی غماز ہے۔ ہندو مذہب کے معتقدات کے مطابق راون کا بیٹا بھی پیدا ہونے کے معاً بعد پورا مرد بن گیا تھا۔

ان سے گفتگو اور اپنا بکھان کرتا ہے۔ ابن مسعود اور محمد رضی اللہ عنہما نے جب یہ تعجب خیز بات سنی تو وہ حضرات دجال کے گھر تشریف لائے۔ اس کی ماں نے اُن حضرات کو اُس تک جانے کا راستہ دیا وہاں اُن لوگوں نے ایک عجیب طرح کی ڈراؤنی صورت دیکھی۔ اس کی پیشانی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے الکافر باللہ اور ایک دوسری روایت کے مطابق ک ف ر یہ تین حروف واضح طور پر نقش تھے۔ اِس کے بعد وہ حضرات وہاں سے اٹھے اور بادلِ بریان و چشم گریان مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔ عشاء کی نماز سے قبل کا وقت تھا نبوت کے سلطانوں کے سلطان اور فتوت کے خاقانوں کے رہبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دجّال کے پیدا ہونے اور اُس کے حالات کی کیفیت آپ سے بیان کی)

"روز دیگر مہتر عالم و قدوۂ اولاد آدم صلی اللہ علیہ وسلم قدم در رکاب آوردہ بہ مقتضای الرفیق ثم الطریق عبداللہ بن مسعود و عمر فاروق را رضی اللہ عنہما سرفراز گردانیدہ و روی بمجمع السال کہ مسقط حال دجّال بدنام بودہ است۔ آوردہ اند چون آن جا رسیدند امیر المومنین حلقہ بر در زد، مادر دجّال استعجال نمود چون مشاہدۂ سید مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کرد باز گشت، دجّال را اخبار کرد، دجّال بہ درآوردن ایشان اشارت کرد، مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم در وقت درآمدن با یارانِ فرمود کہ در دل حرفی اندیشیم تا دجّال آنرا بفراست تواند دریافت یانی۔ حم دخان در ضمیر گرفتند و بہ دجّال درآمدند۔ مربع نشستہ بود۔ بادبیزن در دست گرفتہ خود را بادمی کرد و ساعت بہ ساعت بزرگ می شد و بانظارگیان از ہر باب سخن می گفت۔ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم بہ او اشارت فرمود و گفت، یا دجّال اشہد بانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ دجّال سخن آغاز کردہ گفت یا محمد تو خود گواہی دہ کہ من خدایم۔ سید عالم فرمود۔ لک یا ملعون۔ یارِ دوم شہادت بروی عرض کرد۔ ہمان جوابِ ناصواب باز ہمون بیہودہ بر زبان راند۔ چون مہتر عالم و سرور اولاد آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام از وی نا امید گشت بحدیث دیگر خوض فرمود و از وی استفسار ما فی الضمیر نمود۔ دجّال بر سبیل ارتجال گفت وخرج یعنی حم

دخان خواہد، فرمود بلک اللہ وازاو پناہ بحضرت خداوند جل وعلا برد، آن گاہ فاروق کہ بر فرق تاج صلابت داشت و بر دوش ردای مہابت۔ تیغ از نیام برکشید و بر تارک نامبارک وی فرود آورد۔ شمشیر بالفور باز گشت و بر فرق فاروق چہار انگشت در نشست۔ چنانکہ خون بروی وموی فاروق فرو دوید و بر دجال ہیچ اثر نہ کرد۔ آن گاہ خواجہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ازین معنی بغایت غمگین ومجروح خاطر گشت وگفت: ای عمر انک لن تستیع ان ترد قضاء اللہ تعالیٰ بعد از آن دست حق پرست بر فرق فاروق فرود آورد ولب بہ ثنای الٰہی ودعا شفا خواہی برکشاد وآن زخم ہائل بمیامن ادعیۂ صالحۂ حضرت نبوت وآن جراحت براحت بدل گشت پس از آنجا برخاستند وبہ مدینہ کہ مرکز جلال ومستقر اقبال خواجۂ کائنات بود علیہ الصلوٰۃ والسلام باز آمدند"

(دوسرے دن دنیا کے اعلیٰ ترین فرد، اولادِ آدم کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم نے رکاب میں قدم رنجہ فرمایا اور اس تقاضے کی بنا پر کہ سفر میں کوئی ساتھی ہو، عبداللہ بن مسعود اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو رفیق راہ بننے کے شرف سے مشرف فرمایا اور (اُن حضرات کے ساتھ) دجّال بدنام کے پیدا ہونے کی جگہ مجمع السال کی جانب روانہ ہوئے۔ جب وہ حضرات وہاں پہونچے امیر المومنین نے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی۔ دجّال کی ماں جلدی سے باہر آئی۔ جب اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو واپس گئی اور دجّال کو خبر کی۔ دجّال نے (اپنی ماں کو) اُن حضرات کو اندر لانے کا اشارہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر آتے وقت اپنے اصحاب سے فرمایا میں اپنے دل میں ایک بات سوچتا ہوں دیکھوں دجّال اپنی فراست سے اس کو سمجھ پاتا ہے یا نہیں؟ انھوں نے (سورہ) دخان کی حٰمٓ اپنے دل میں سوچی اور دجّال کے پاس آئے وہ پلتھی مارے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں پنکھا لیے خود کو جھل رہا تھا اور ہر گھنٹے بڑھ رہا تھا۔ اُس کے گرد اس کو دیکھنے والوں کا جو مجمع تھا اُس سے ہر موضوع پر بات کر رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ اے دجّال شہادت دے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ دجّال نے بات شروع کرتے ہوئے

کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ خود گواہی دیں کہ میں (دجّال) خدا ہوں سید عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا، اے لعنتی تجھ پر اللہ کی لعنت ہو، آپ نے دوبارہ اس سے (اپنے رسول ہونے کی) شہادت طلب کی، اُس نے وہی غلط جواب دوبارہ دیا۔ تیسری مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ (کہنے) کی اس کو ترغیب دی وہ پھر وہی بیہودہ بات اپنی زبان پر لے آیا۔ جب دنیا کے اعلیٰ ترین فرد اور اولادِ آدم کے سردار (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس سے نا امید ہو گئے آپؐ نے دوسری بات کی طرف رجوع فرمایا: اور اُس کے بارے میں سوال کیا۔ دجّال نے فوراً کہا (سورۂ) دخان کی قسم ہو گی۔ آپ نے فرمایا اللہ تجھ کو ہلاک کرے (پھر) آپ نے اُس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگی۔ اُس وقت فاروق (رضی اللہ عنہ) نے جو کہ سر پر فولادیت کا تاج اور کاندھوں پر ہیبت کی چادر رکھتے تھے، اپنی میان سے تلوار نکالی اور اُس کے نامبارک سر پر دے ماری۔ تلوار فوراً واپس ہوئی اور فاروق (رضی اللہ عنہ) کی پیشانی میں اس طرح چار انگل گھس گئی کہ اُن کے بالوں اور چہرے پر خون رواں ہو گیا۔ دجّال پر (تلوار کی ضرب کا) کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُس وقت آنحضرت علیہ السلام اس بات سے بہت دل شکستہ اور غمگین ہوئے اور آپ نے فرمایا "اے عمر تم اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ اللہ کی قضا کو رد کر دو" اس کے بعد آپ نے اپنا حق پرست ہاتھ فاروق (رضی اللہ عنہ) کے سر پر رکھا اور اپنے ہونٹوں کو اللہ تعالیٰ کی ثنا اور (فاروقؓ) کی شفا کی دعا کے لیے کھولا وہ خطرناک زخم اور وہ چوٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صالح دعاؤں کی برکت سے راحت میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد وہ حضرات وہاں سے اٹھے اور اُس مدینے واپس آ گئے جو خواجہ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جلال کا مرکز اور اقبال کا جائے قیام تھا۔)

"و روایتی ہست کہ دجّال عقب آنحضرت نعلین عدوان در پای کردہ عصای عصیان در دست گرفتہ بمدینہ آمد و چون خلق خلقت کریہہ دہیت شویۂ وی مشاہدہ کردند گروہ انبوہ کردہ گرد وی در آمدند۔ دجّال استعجال نمودہ بر کوہ دوید و از قلۂ کوہ سنگِ باشکوہ برکند و آن گروہ را در وی محبوس کرد چنانکہ منافذ طریق

بدان صخرۂ صماسدود گشت وچون سدّ ذوالقرنین در نظر آن قوم استوار نمود۔ مومنان ہولناک شدند واز دست مکرو دستانِ غدر او بغایت ترسیدند عمر رضی اللہ عنہ بسید علیہ السلام در آمد گونۂ او متغیر گشتہ مہتر عالم فرمود یا عمر چہ حادث گشتہ است آثار تغیر در جبینِ تو مُبیّن است ونشان پریشانی بر پیشانی ظاہر۔ گفت، یارسول اللہ شر دجّال وفتنۂ آن بطّال ظہور کرد وجمعی از مومنان رادر جای محبوس کرد بصخور صما مستحکم گردانید وبکید وسحر آن سنگ بر دیوار مشید ساخت، آن گاہ زبدۂ عالم برخاست بازمرۂ اتباع واشیاع بیرون آمد دست بہ دعا برداشتہ گفت ملکا ذوالجلالا مکر شر باشر این ملعون را از امت من تو دفع گردانی تا بآن اجل مسمیٰ کہ تو دانی سمیع الدعا جل وعلا دعای او بسمع اجابت اصغا در حال بی اہمال از مرغزار آسمان قدرت مرغی نازل گشت ودجّال را بچنگال نکال گرفتہ بہ ہوای عام در اوج بُرد (دراصل 'درد' آمدہ) ہرچند دُجّال ابتہال می نمود وفریاد می کرد کہ یا محمد مرا از چنگال نکال این مرغ نجاتی عطا فرما واز منقار عقاب ابن عقاب خلاص ارزانی دار سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم آن مرغ را بتازیانہ امر اشارت می کرد کہ اورا ازاین دیار دور ببر (دراصل "بیر" آمدہ) گویند کہ آن طیر سریع السیر دجال را چندان برد کہ بدیار طبرستان رسانید بدریای کہ بجوار آن طرف است در جزیرۂ انداخت"

(اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس کے بعد دجال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے دشمنی کے جوتے پاؤں میں پہنے اور گناہوں کا عصا ہاتھ میں لیے مدینے آیا جب لوگوں نے اس کا کریہہ ناک نقشہ اور منحوس شکل دیکھی لوگوں کا گروہ اس کے گرد جمع ہو گیا دجال جلدی سے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور چوٹی پر بڑے بڑے پتھر کھودے اور (غار بنا لیا) لوگوں کو اُس (غار) میں قید کر کے اس کا منہ پتھروں سے بند کر دیا اور لوگوں کی نظر میں وہ گویا سدّ ذوالقرنین ہو گیا۔ مسلمان گھبرا گئے اور اُس کے مکر و فریب کے ہاتھوں بہت گھبرائے۔ عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تشریف لائے۔ اُن کا چہرہ متغیر ہو گیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اے عمر کیا حادثہ ہو گیا ہے کہ تمہارے چہرے

سے تغیر کا حال ظاہر ہو رہا ہے اور پریشانی کے آثار پیشانی پر نمایاں ہیں۔ انھوں نے جواب دیا یا رسول اللہ، دجّال کا شر اور اُس باطل شخص کا فتنہ ظاہر ہو گیا ہے۔ اُس نے مومنوں کی ایک جماعت کو ایک جگہ قید کر دیا ہے اور اُس کا منہ بڑے بڑے پتھروں سے بند کر دیا ہے اور دھوکے اور سحر سے اُس چٹان کو دیوار پر مضبوط بنا دیا ہے۔ اسی وقت وہ زبدۂ عالم اپنے اصحاب کے ساتھ باہر آئے (یعنی حصار کے باہری حصے پر تشریف لائے) اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر فرمایا۔ اے مالک اے صاحبِ جلال تو اس کے شر سے محفوظ رکھ (اور) میری امت سے اس ملعون کو دفع کر دے[1] دعا سننے والی اعلیٰ ذات نے دعا قبول فرمائی، اُسی لمحے آسمان کے مرغزار سے ایک پرندہ نازل ہوا اور دجّال کو سزا کے چنگل میں جکڑ لیا اور فضا میں بلندی کی طرف لے گیا۔ دجّال ہر چند عاجزی کر رہا تھا اور چیخ رہا تھا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھ کو سزا دینے والے اس پرندے کے چنگل سے نجات عطا فرمائیے اور اس عقاب سے جو کہ عقاب ہی کا بچہ ہے چھٹکارا دلائیے۔ دنیا کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم اُس پرندے کو اپنے حکم کے کوڑے سے اشارہ فرما رہے تھے کہ اُس (دجال) کو اِس دیار سے دور نرلے جا۔ کہتے ہیں کہ وہ تیز اڑنے والا پرندہ دجّال کو اس طرح لے گیا کہ وہ اس کو لیے ہوئے طبرستان کے دیار میں پہونچا اور اُس طرف کے ایک دریا کے جزیرے میں اُس کو ڈال دیا۔)

درج بالا روایتوں میں جو باتیں تحریر کی گئی ہیں اُن کے بے سروپا ہونے میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو مگر اس دنیا میں "خوش عقیدہ" افراد کی بھی کمی نہیں ہے، ان کو مدنظر رکھتے ہوئے چند اصولی اور اساسی باتوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ یاد دلانے کی ہے کہ درج بالا اقتباس میں جو روایتیں بیان کی گئی ہیں اُن کے ماخذ کی طرف مفسر نے کوئی مبہم سا بھی اشارہ نہیں کیا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا کہ اِن روایتوں کا تعلق سینہ بہ سینہ چلی آنے والی

---

[1] اِس جملے کا متن غیر واضح ہے اس لیے مرادی ترجمہ کیا گیا ہے۔

حکایتوں اور کہانیوں سے ہے یا اِن کا کوئی تحریری وجود ہے اسی وجہ سے ہم مفسر کی بیان کردہ باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کر سکتے۔ دوسری چیز جو ہم کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ معین الدین فراہی ہروی علاماتِ قیامت پر اظہار خیال فرما رہے ہیں اور اس سلسلے میں ان کو جتنی اور جیسی رطب و یابس روایتیں کتابوں میں درج یا سینوں میں محفوظ مل سکی ہیں اُن سب کو بلا کسی حوالے کے انھوں نے 'اسرار الفاتحہ' میں جمع کر دیا ہے۔ جہاں تک ہماری محدود نظر ہے اُس کے مطابق خروج دجّال کے بارے میں جو احادیث ملتی ہیں اُن کا تعلق علاماتِ قیامت بیان کرنے والی حدیثوں سے ہے۔ ان احادیث کے بارے میں بھی علماء میں خاصا اختلاف ہے مگر اس بات پر سب ہی متفق ہیں کہ دجّال کا خروج قیامت آنے سے قبل ہوگا۔ خود معین الدین فراہی ہروی کو اِس بات کا علم ہے کہ احادیث میں کیا بیان کیا گیا ہے۔ سخت حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ اِس کے باوجود انھوں نے ایک ایسی روایت نقل کی ہے جو اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ دجّال کی ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ حیات ہی میں ہو گئی تھی۔

ستم بالائے ستم یہ کہ معین الدین فراہی ہروی اِس روایت پر کوئی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتے کہ حضرت عمرؓ کی چلائی تلوار الٹ کر اُنھی پر آتی ہے اور اُن کو زخمی کر دیتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ حضرت عمرؓ کے ساتھ ہیں مگر وہ اُن کی کوئی مدد نہیں فرماتے اور ضربتِ شمشیر کو تقدیرِ الٰہی قرار دے کر حضرت عمرؓ کو صبر کی تلقین کر کے رہ جاتے ہیں۔

علاوہ بریں دجّال کا پہاڑ پر چڑھنے اور سخت چٹانوں کو پھینک پھینک کر غار بنا کر مسلمانوں کو قید کر لینے کی بات بھی مضحکہ خیز ہے یہ بات جس انداز سے کہی گئی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حصار میں مسلمان محصور ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ وہاں تشریف لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو دجّال کو دیکھ سکے نہ ہی اُس حصار کو (حالانکہ دجّال بلندی پر تھا اور حصار حضور اکرمؐ کے سامنے) اس لیے انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے کہ تمہارا چہرہ متغیر ہو گیا ہے اور پریشانی کے آثار بپشانی پر نمایاں ہیں۔ اِس سوال

پر حضرت عمرؓ جواب دیتے ہیں کہ یا رسول اللہ دجّال کا فتنہ ظاہر ہو گیا ہے۔ اس بات کو ماننا اور اس پر یقین کرنا ہمارے نزدیک مومنانہ شان کے خلاف ہے۔ جس فتنے کی خبر اللہ نے اپنے رسول کو دی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پوری امت واقف ہوئی ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ فتنہ ظاہر ہو جائے اور ایک غیر نبی، نبی کو بتلائے کہ "دجال کا فتنہ ظاہر ہو گیا ہے"۔ ہمارے نزدیک ایسا سوچنا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے مترادف ہے۔

ایک بات اور ہماری سمجھ میں نہ آسکی کہ معین الدین فراہی ہروی نے دجّال کو عقاب کے ذریعہ طبرستان کے دریا کے اُس پار کیوں پھنکوایا کسی ایسے ملک میں کیوں نہ پھنکوایا جہاں اُس وقت مسلمان نہ پہونچے تھے۔ طبرستان سے اُن کو پرخاش کیوں تھی اِس سوال کا جواب دینے سے ہم قاصر ہیں۔ اسی سلسلۂ سخن میں یہ بھی یاد دلانے کو جی چاہتا ہے کہ ایک حدیث ایسی بھی نظر سے گذری ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "دجال کا فتنہ خراسان سے ظاہر ہوگا" (دونوں مقامات ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں) اس بات کا فیصلہ تو ہمارے محدثین ہی کریں گے کہ مذکورہ حدیث کی حیثیت کیا ہے؟ ہم کو تو یہ دکھلانا مقصود ہے کہ ایک روایت ایسی بھی ہے جس میں 'خراسان' کا ذکر ہوا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ ایرانی مفسر بھی اس بات کا قایل نظر آتا ہے کہ دجّال کا مولد عرب نہیں عجم ہوگا۔

اب تک ہم نے 'اسرار الفاتحہ' کے شروع اور تقریباً وسط کی ایک ایک عبارت کا مطالعہ اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب ہم اس کی چودھویں مجلس کی ایک عبارت کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے اسرار الفاتحہ پندرہ مجلسوں پر مشتمل ہے، پندرہویں مجلس 'آمین' کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس لیے ہم نے چودھویں مجلس کا انتخاب کیا ہے۔ جو غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ اس مجلس میں ایک مقدمہ اور چار فصلیں ہیں۔ چوتھی فصل اس آیت سے مستنبط اسرار کے بیان میں ہے جن کی تعداد چار ہے۔ سرِ اول کے تحت معین الدین فراہی رقم طراز ہیں۔

"غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ اول سِر آنست باید دانستن کہ غضب حق تعالیٰ راندگان[1] را باشد

---

[1] اصل 'راندگان'۔

وضلالت در جادہ فرو ماندگان را باشد مغضوب علیہ از درگاہ محروم[1] ماندہ و راہ گم[2] کردہ و سرگردان در بیابان پی بہ مقصود بیرون نبردہ، مغضوب علیہ را امید بہبود نیست از بہر آنکہ بادشاہ بر وخشم گرفتہ واز درگاہش راندہ وضلال را امید بہبود ہست کہ حق تعالیٰ ہنوز مشعلہ دار مسافران است، انبیاء ہنوز اندر بادیہ دلیل می کنند و امیال می کنند و امیال قرآن بر سر حد بیابان برہان نہندہ سبیل می نماید۔ لاجرم کہ جہودان بروایت مشہورہ مغضوب علیہم کنایت از ایشانست ہرگز از غضب خداوند سبحانہ نجات نیابند و ترسایان کہ ولا الضالین اشارت بہ ایشان است بہ مشعلہ داری عیسیٰ علیہ السلام در آخر الزمان از تاریکی ضلالت بہ روشنائی ہدایت مشرف گردند اللہ ولی الذین آمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیٰہم الطاغوت یخرجونہم من النور الی الظلمات۔"

(اول تو تم کو یہ جان لینا چاہیے کہ حق تعالیٰ کا غضب راندۂ درگاہ افراد کے لیے ہوتا ہے اور ضلالت راستے میں عاجز رہ جانے والوں کے لیے مغضوب علیہ درگاہ سے نکالا ہوا، راہ سے محروم، بیابان میں سرگرداں اور منزل مقصود سے دور پڑا ہوا (ہوتا ہے) مغضوب علیہ کی بھلائی کی امید نہیں ہے اس لیے کہ بادشاہ اُس سے خفا ہے۔ اور اُس نے مغضوب علیہ کو اپنی بارگاہ سے نکال دیا ہے اور ضلال (بھٹکا ہوا) کو بھلائی کی امید ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ اب بھی مسافروں کو مشعل راہ دکھا رہا ہے اور انبیاء اب بھی وادیٔ (پرخار) میں راہ نمائی فرما رہے ہیں اور آسانیاں پیدا کر رہے ہیں اور قرآن پاک کے رجحانات بیان کے سرحد پر دلائل نصب کر رہے ہیں اور راستہ پیدا کر رہے ہیں۔ بلا شبہ مشہور روایت کے مطابق مغضوب علیہم کا اشارہ یہود کی طرف ہے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے کبھی نجات نہیں پائیں گے اور نصاریٰ جن کی طرف ولا الضالین میں اشارہ ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کی روشنی دکھانے کی وجہ سے آخری زمانے میں ضلالت

---

[1] محروم اور ماندہ کے الفاظ کے درمیان "زادہ عماز" بھی شائع ہوا ہے جس کو ہم نے نقل نہیں کیا ہے۔
[2] "تا در راہ گم کردہ" شائع ہوا ہے۔

(گم کردہ راہی) کے اندھیرے سے نکل کر ہدایت کی روشنی سے مشرف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ساتھی ہے اُن لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (یا بچا کر) نورِ (اسلام) کی طرف لاتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں اُن کے ساتھی شیاطین ہیں (انسی و جنّی) وہ اُن کو نور (اسلام) سے نکال کر (یا بچا کر کفر کی) تاریکیوں تک لاتا ہے[۱]")

"پس ای درویش اگر خواہی کہ درین مسافرت از ضلالت مصُون و محفوظ باشی و درین سفر از گمراہی ایمن گردی ترا در بادیۂ اول سفر در وجود تست از بہر آنکہ وجود تو نمود ہفت آسمان و زمین است ترا بر بام جہانِ باید شدن و نردبان از نہاد خود ساختن و این نہاد تو ہفت آسمان و زمین است در یکدگر سرشتہ از یک دیگر فرو کشا کہ تا چون ازین بند بدر شوی از طاقِ نہ رواق آسمان برتر گذری نسخۂ ہفتِ آسمان و زمین در جیبِ تست بہ نسخۂ خود فرو نگر تا از مطالعۂ کتب خانۂ کونین فارغ شوی قالب تو نمودار قالب ہفت آسمان و زمین ست و جانِ تو سپر جوشن جان ست ہفت آسمان و زمینِ امر حق است و من آیاتہ اَن تقوم السماءُ والارض بامرہ، و جان تو نیز باز بستۂ امر حق سبحانہ قل الروح من امر ربّی اسرار ہفت آسمان و زمین بجان تو می پیوند دُیُدَبِّر الامر من السماء اِلی الارض، آن گاہ از رہ جان تو بر قالب ترشح می کند و در ہیئتِ گفتار و کردار از رہ جانِ تو با حضرت کبریا می شود جل و علا۔ ثُمَّ یَعرُجُ عَلَیۡہِ پس تو اول درین سفر نردبانِ قالب از آسمان و زمین برگذار آنگاہ نردبانِ جان بدیوار امر حق تعالیٰ با زبنہ کہ امر بہ آن حضرت واصل است الی اللہ تصیر الامور تو نیز با امر وصول پذیرفتہ خود را در عالم ربوبیت انداز۔ اِنّا للہ و انا الیہ راجعون۔ تا بہ ولایت خدا جل و علا ہناک الولایۃ للہ الحق تا بہ مقصد بہ سلامت برسی و از ضلالت و غوایت محفوظ مانی۔"

(اے درویش اگر تو چاہتا ہے کہ اس سفر میں ضلالت سے محفوظ و مامون

---

[۱] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۷، ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی۔

رہے اور اس مسافت میں گم راہی سے بچا رہے تو تجھ کو پہلے ہی جنگل (؟) میں اپنے وجود کا سفر کرنا ہے اس لیے کہ تیرا وجود ساتوں آسمان اور زمین کے پیدا ہونے کا سبب ہے۔ تجھ کو دنیا کی بلندی پر چڑھنا چاہئے اور اپنی ذات کو سیڑھی بنانا چاہیے اور تیری ذات ہی ہفت آسمان و زمین ہے جو ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں، اُن کو ایک دوسرے سے جدا کر تاکہ جب تو اس بند سے باہر آئے (یعنی مرے) تو تو آسمان کی نو منزلوں کے طاقوں سے (بھی) اوپر چلا جائے۔ ساتوں آسمان اور زمین کا نسخہ (کتاب) تیری جیب میں ہے، اپنے نسخے (کتاب) کو دیکھ تاکہ کونین کے کتابخانے کے مطالعے سے بے نیاز ہو جا۔ تیرا بدن ساتوں آسمان اور زمین کا آئینہ دار ہے اور تیری جان امرِ حق کے ساتوں آسمان اور زمین کے جوشن کی ڈھال ہے اور اُسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اُس کے حکم سے قائم ہیں[1]۔ اور تیری جان اللہ کے حکم سے وابستہ ہے آپ فرما دیجئے روح میرے حکم سے بنی ہے[2]۔ ساتوں آسمان اور زمین کے اسرار و رموز تیری جان سے پیوست ہیں "وہ آسمان سے لے کر زمین تک ہر امر کی تدبیر کرتا ہے[3]۔" پھر وہ تیری روح سے جسم پر برستے ہیں اور تیرے قول اور فعل کی شکل میں تیری روح سے بزرگ و برتر اللہ تعالیٰ تک پہونچتے ہیں پھر مزید اوپر چڑھتے ہیں اس لیے تو اِس پہلے سفر میں جسم کی سیڑھی کو آسمان اور زمین سے اوپر اٹھا اور پھر جان کی سیڑھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی دیوار کے ساتھ اور اُس زینے سے (لگا) جس کا حکم اُس کی درگاہ سے متصل ہے۔ تمام حالات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں تو بھی وصل کے حکم کو قبول کر کے اپنے آپ کو عالم ربوبیت میں ڈال دے۔ "ہم تو (مع مال و اولاد حقیقتاً) اللہ تعالیٰ

---

[1] سورۂ روم، آیت ۲۵ کا ٹکڑا، ترجمہ مولانا تھانوی۔
[2] بنی اسرائیل آیت ۸۵ ترجمہ مولانا تھانوی۔
[3] سورۂ سجدہ، آیت ۵ کا ٹکڑا، ترجمہ مولانا تھانوی۔

ہی کی مِلک ہیں اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں[1]"
تاکہ اللہ بزرگ و برتر کی سرپرستی سے تو اپنے مقصد تک سلامتی سے پہونچ جائے
اور ضلالت و گمراہی سے محفوظ رہے[2]

درج بالا اقتباس میں معین الدین فراہی ہروی نے مغضوب علیہ اور ضالین کی جو تشریح کی ہے اُس میں وہ منفرد نہیں ہیں ان سے پہلے اور بعد کے بھی مفسرین مغضوب علیہم سے یہود اور ضالین سے نصاریٰ مراد لیتے رہے ہیں اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرتِ حق کے راندۂ درگاہ کے مقابلے میں گم کردہ راہ کم درجے کا خاطی ہے اور اس بات کا امکان باقی رہتا ہے کہ گم کردہ راہ کو کبھی صراط مستقیم مل جائے اور وہ ضالین کی صف سے نکل کر مومنین کی صف میں کھڑا ہو جائے۔

اس اقتباس میں معین الدین فراہی ہروی نے درویش کو مخاطب کرتے ہوئے جو باتیں کہی ہیں اُن میں سے بعض گنجلک ہیں اور بعض معنی و مفہوم کے لحاظ سے اچھی اور سمجھ میں آنے والی ہیں مگر اُن کا غیر المغضوب علیہم ولا الضالین سے کیا تعلق ہے یہ ہم جیسے عامی کی سمجھ سے باہر ہے اِس لیے اُن سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ اس ضخیم تفسیر کے تین نمونوں کے مطالعے سے پوری تفسیر کے مطالعے کا حق ادا نہیں ہوتا اِن سطور کو اسرار الفاتحہ کا ایک تعارف سمجھنا چاہیے اور یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ نویں صدی ہجری میں تفسیر لکھنے کا ایک انداز یہ بھی تھا۔

---

[1] سورۂ بقرہ، ۱۵۶

[2] اِس "سِر" کی عقدہ کشائی میں مدد دینے کے لیے میں ڈاکٹر رئیس نعمانی کا شکر گذار ہوں۔

عہدِ نبوی کے غزوات و سرایا

ڈاکٹر رؤفہ اقبال صاحبہ نے اس تصنیف میں اسلام کے نظریہ جہاد پر اسلامی موقف کی بے لاگ ترجمانی کی ہے اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب دیا ہے۔

آفسٹ کی طباعت۔ صفحات ۲۴۷ قیمت ۲۵ روپئے

ملنے کا پتا: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

انگریزی عہد میں اسلامی تہذیب

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

اٹھارہویں صدی عیسوی ہندوستان اور مسلمانوں کے لیے سیاسی بدنظمی ، اقتصادی بحران کا عہد تھا، اس عہد میں اسلام مخالف طاقتیں خواہ اندرون ملک کی ہوں مثلاً سکھ اور مرہٹے یا بیرون ملک کی ہوں مثلاً پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز ملک پر قبضہ جمانے کے لیے شورشوں اور سازشوں کا جال پھیلائے ہوئے تھیں۔ حکمراں مغلیہ خاندان اپنی نااہلی اور کمزوری کے باعث ان سب کا مقابلہ کرنے سے قاصر اور ان کے آگے بے بس تھا۔ ان طاقتوں میں انگریز زیادہ چالاک، عیار اور صاحب ثروت تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی بینر کے نیچے برطانوی اقتدار کے قیام کی راہ ہموار کر رہے تھے اور حکومت تک پہونچنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں اسلامی تہذیب ہندوستان میں شکست وریخت کے کٹھن مراحل سے گذری، مسلمان سیاسی طور پر مغلوب اور محکوم ہوئے، اقتصادی طور پر تباہ و برباد کیے گئے ان کی ضعیف الاعتقادی اور اخلاقی کمزوری بھی زیادہ ابھر کر سامنے آئی اور ان کی عزت اور وجاہت سب کچھ جاتی رہی۔ انگریزوں نے اسلامی تہذیب کے آثار مٹانے اور انگریزی تہذیب کے نقش جمانے کے لیے طاقت، حیلہ اور مکر و فریب سے کام لینا شروع کیا، ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک سیاسی اور اقتصادی طور پر انگریز پیش قدمی کرتے رہے اور اپنے تعلیمی و ثقافتی مراکز قائم کرتے رہے جبکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۴۷ء تک وہ اس ملک کے حکمراں رہے اور سیاست، معیشت، تعلیم، ثقافت سب کچھ انہی کے کنٹرول میں تھا وہی سیاہ سفید کے مالک تھے۔

۱۷۵۷ء کی پلاسی کی جنگ میں انگریزوں نے مسلمانوں کو شکست دے کر ہندوستان میں اپنا اثر قائم کرنے کا حوصلہ پایا۔ یہ گویا انگریزوں کے سیاسی اثر و رسوخ کی پہلی منزل تھی۔ ۱۷٦۴ء میں بکسر کی جنگ میں مسلمانوں کی شکست نے بہار و بنگال میں انگریزی حکومت کا راستہ صاف کر دیا۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو شہید ہوئے اور میسور کی ریاست مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی، مگر صحیح معنوں میں انگریزوں کے اقتدار کی شروعات ۱۷۷۳ء سے ہوتی ہے جبکہ ریگولیٹنگ ایکٹ منظور ہوا اور ۱۷۷۴ء میں نافذ ہوا، اس ایکٹ کی رُو سے ہندوستان کے عمّال حکومت پارلیامنٹ اور وزارت انگلستان کے سامنے جوابدہ قرار دیے گئے اور انگریزی طاقت کو متحد کرنے کے لیے صوبہ بمبئی اور مدراس کو بنگال کے ماتحت کر دیا گیا۔[1]

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی پر حملہ کر کے بادشاہ شاہ عالم کو گرفتار کیا اور اس کو ایک ایسا معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا جس کے ذریعہ بادشاہ کی حکومت شہر قلعہ دہلی تا قطب محدود کر کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت جیسے فارسی زبان اور قاضیوں کا تقرر وغیرہ اپنے ذمہ لے لیا[2] اور عوامی طور پر یہ مشہور ہو گیا "حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم"۔ ۱۸۲۷ء میں لارڈ امہرسٹ نے اعلان کر دیا کہ ہماری گورنمنٹ اب تیموریہ خاندان کے تابع نہیں ہے بلکہ وہ خود ہندوستان کی بادشاہ ہے۔[3]

شاہ عبدالعزیز (م ۱۸۲۴ء) نے جو فقہاء کے سرخیل تھے انگریزوں کے خلاف اپنے مشہور فتویٰ میں اس کی صراحت کی ہے کہ :۔

> "اس شہر دہلی میں اسلامی قانون بالکل عمل میں نہیں آیا اور عیسائی حکمرانوں کا قانون بغیر کسی رکاوٹ کے رائج ہے جیسا کہ انتظامی اور دیوانی معاملات میں ہے، یا سزاؤں کے سلسلہ میں غیر مسلموں کا تسلط قطعی ہے۔ البتہ وہ مسلمانوں کے رسوم یعنی نماز عید اور جمعہ میں دخل انداز

---

[1] عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۳۸، کراچی ۱۹٦۷ء

[2] فضل حق خیرآبادی، الثورۃ الہندیۃ اردو ترجمہ، ص ۱۹۰، اعظم گڑھ ۱۹۸۴ء

[3] سرسید احمد خاں، اسباب بغاوت ہند ص ۱۰، لاہور ۱۹۵۷ء

نہیں ہوتے ۔ یا اذان اور قربانی کے سلسلہ میں اعتراض نہیں کرتے، لیکن ان کا بڑا اصول یہ ہے کہ اپنی مطلق حکمرانی سے نفع حاصل کریں اس شہر سے کلکتہ تک انگریزوں کا راج مکمل ہے "[1]

۱۸۵۷ء میں ہندو اور مسلمان فوجیوں نے مل کر بغاوت کی عوام نے بھی ان کا ساتھ دیا مگر یہ بغاوت ناکام ہوگئی ۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر گرفتار کرکے رنگون جلا وطن کیا گیا، شاہزادوں، باغیوں اور علماء کی بڑی تعداد پھانسی پر لٹکائی گئی، رسمی طور پر بھی مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور ملک پوری طرح انگریزوں کی غلامی میں چلا گیا ۔ چنانچہ ۱۸۰۳ء تا ۱۹۴۷ء تک کا ڈیڑھ سو سالہ عہد ہندوستانیوں کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص غلامی کا عہد ہے، کیونکہ یہ صرف اقتدار کی منتقلی اور حکومت کرنے والے افراد کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ نظریہ سیاست، معیشت، تہذیب تعلیم ادب اور سماج سب کچھ کی تبدیلی کا اعلان تھا اور اس تبدیلی کے آثار زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں تھے ۔ اس کے اثرات سے آج تک ہندوستانی عوام اپنے کو آزاد نہ کرسکے ۔ اگرچہ ملکی آزادی کو پچاس سال کا عرصہ گزر گیا ۔ انگریزی حکومت کے دور رس اور ہمہ جہت اثرات کے تفصیلی جائزے کی گنجائش نہیں البتہ بعض اہم اثرات کی نشاندہی کی جاتی ہے ۔

معاشی اور اقتصادی اثرات

انگریزی اقتدار کا برا اثر مسلمانوں کی معیشت اور اقتصادی حالت پر پڑا، جو لوگ حکمراں، امراء اور اصحابِ ثروت تھے ان کی جائداد ضبط کی جاچکی تھی، ان کے کاروبار ختم ہوچکے تھے اور ان کی صنعت تباہ ہوچکی تھی، کپڑا بننے کی صنعت جو مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، اس کا کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور صنعت کار، مزدور سبھی اپنی محنت کے صلہ اور جائز منافع سے محروم کردیے گئے تھے ۔ جوارِ دہلی میں نیل کی کاشت بھاری ٹیکس کی نذر ہوچکی تھی ۔

---

[1] شاہ عبدالعزیز دہلوی، فتاویٰ عزیزیہ ص ۱۷، ۱۶ کانپور ۱۹۰۴ء

بنگال جو سلطنتِ مغلیہ کا سب سے زرخیز اور خوش حال صوبہ تھا اور جسے سلطنت ہند کی پیداوار کا ذخیرہ کہا جاتا تھا اس کا حال یہ ہو گیا کہ چند ہی دنوں میں غیر آباد ہو کر رہ گیا، کاشتکار زمین چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے [1] گورنمنٹ کی طرف سے بھاری ٹیکس اور اس کی وصولیابی میں بے رحمی اور کوڑوں کی سزاؤں نے معیشت کو تباہ کر دیا، دوسری طرف مسلمان جاگیرداروں اور زمین داروں کی تمام املاک جو وسعت میں تمام بنگال کی ایک چوتھائی تھی، گورنمنٹ نے ضبط کر لی۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے سیکڑوں شریف اور خوش حال خاندان نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے اور ہزاروں افراد بے کسی اور مفلسی کے عالم میں دربدر پھرنے لگے [2]

اڑلیسہ کے مسلمانوں نے ملکۂ برطانیہ کو اپنی معاشی بدحالی کی طرف توجہ دلانے کے لیے درخواست بھیجی جس میں وضاحت تھی کہ اڑلیسہ کے مسلمان اس قدر تباہ کر دیے گئے ہیں کہ اب ابھرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی.... ہماری حالت ان مچھلیوں کی طرح ہے جو پانی سے نکال کر باہر پھینک دی گئی ہوں۔ سرکاری ملازمتوں سے خارج ہونے کے بعد ہم مفلسی اور مایوسی کے اس درجہ کو پہونچ گئے ہیں کہ اگر بیس روپے ماہوار کی نوکری بھی مرحمت ہو جائے تو ہم دنیا کے سب سے زیادہ دور دراز مقامات تک جانے، ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھ جانے اور سائبیریا کے سنسان بیابانوں میں بھٹکتے پھرنے کو بخوشی تیار ہیں۔" [3]

مسلمانوں کی معیشت کا بڑا انحصار سرکاری ملازمت پر تھا مگر انگریزی حکومت میں یہ دروازہ ان کے لیے بند ہو گیا، درجۂ اول کی ملازمت انگریزوں اور درجہ دوم کی ملازمت ہندوؤں کے لیے تھیں۔ ہنٹر نے لکھا ہے کہ "مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمۂ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کے جواز میں بہت سے دلائل موجود ہیں گو اس میں شک نہیں کہ اس طرزِ عمل سے

---

[1] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ صنہ

[2] سردار عبدالرحیم، خطبۂ صدارت اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ علی گڑھ ۱۹۲۵ء

[3] ڈبلو، ڈبلو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان اردو ترجمہ صادق حسین ص۲۵۶، اقبال اکیڈمی، لاہور

بنگال کے گھرانے بالکل تباہ و برباد ہوگئے"[1] ہنٹر نے مزید لکھا ہے کہ "مسلمان یہاں تک اب قعرِ مذلت میں گر چکے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمتوں کے قابل ہوں تب بھی ان کو سرکاری اعلانات کے ذریعہ ملازمت سے باز رکھا جاتا ہے ان کی قابلِ رحم حالت پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔"[2]

انگریزوں نے فارسی زبان ختم کر کے انگریزی کو سرکاری زبان بنایا اور سرکاری دفاتر میں کام کاج کے لیے انگریزی کا جاننا لازم ہوگیا چنانچہ ملازمتیں ان لوگوں کو دی جانے لگیں جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ گورنمنٹ نے اشتہار جاری کیا کہ جو شخص سرکاری مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور انگریزی زبان میں سند یافتہ ہوگا وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکٹ پر جن کو سب لوگ کالا پادری سمجھتے تھے، منحصر ہوگئیں[3] مسلمان انگریزی تعلیم سے دور اس لیے رہے کہ اس کے ساتھ مسیحی مذہب کی اشاعت جوڑ دی گئی تھی۔ مجموعی طور پر نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان معاشی طور پر پریشان اور تباہ حال ہوگئے، یہاں تک کہ بنگال کے قحط کے ایام میں بعض نادار افراد نے اپنے بچوں کو بیچ ڈالا۔

انگریزوں کی معاشی پالیسی کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے اسی عہد کے آخر میں لکھا تھا:

> "گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی اب وہ روٹیوں کو محتاج ہو چکی ہے، اس کو معیشت کے ذرائع سے ایک ایک کر کے محروم کر دیا گیا ہے اور اب اس کی ۹۰ فی صد آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے، ساہوکار سے برطانوی سامراج کا مستقل اتحاد ہے اور برطانوی نظامِ عدالت اس کے لیے وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو سود خوار پٹھان کے لیے اس کا ڈنڈا انجام دیتا ہے۔"[4]

---

[1] ایضاً ص ۲۴۲ [2] ایضاً ص ۲۵۵ [3] اسباب بغاوتِ ہند ص ۱۲۸

[4] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تحریکِ آزادئ ہند اور مسلمان ۱/۴۶، لاہور ۱۹۸۲ء

مذہبی اثرات

انگریزوں کے قدم جمانے کے ساتھ ہی ہندوستان میں مسیحی مبلغین کی جماعتیں تبلیغ میں سرگرم عمل ہوئیں، ان میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں جماعتیں شامل تھیں۔ عیسائیت کا پہلا مبلغ سینٹ ٹامس تھا اس کے بعد دوسرا ٹامس فرانسوازیوتری نے تبلیغ کی کوشش کی[۱] ۱۸۱۳ء تک یہ جماعتیں اپنے طور پر مسیحیت کا پرچار کرتی رہیں مگر ان کے کچھ زیادہ اثرات اہلِ ہند پر نہ پڑے۔ اگر پڑے بھی تو ساحلی علاقوں تک محدود رہے، ۱۸۱۳ء کے بعد ان کو سرکاری حمایت اور سرپرستی حاصل ہوگئی، اس سال ایسٹ انڈیا کمپنی کے منشور کی تجدید ہوئی تو برطانوی پارلیامنٹ نے اصرار کیا کہ اس میں ایک دفعہ یہ شامل کی جائے جس میں یورپ کے مسیحی مبلغین کو ہندوستان میں تبلیغ کرنے اور آباد ہونے کی اجازت دی جائے[۲]

اس کے بعد مسیحی پادریوں اور مبلغوں کا سیلاب امنڈ آیا ۱۸۶۵ء میں ان کی کارکردگی کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے مستشرق گارساں دتاسی نے فرانس میں کہا تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس وقت ۵۱۵ مبلغین مسیحیت کا کام کر رہے ہیں۔ ان میں انگلیکن اور دوسرے غیر کیتھولک شامل ہیں ہمارے خیال میں کیتھولک مبلغین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی اس لیے کہ اس وقت ہندوستان میں کم و بیش دس لاکھ کیتھولک موجود ہیں[۳]

عیسائی مبلغین کو نہ صرف حکومت کی سرپرستی حاصل تھی بلکہ انگریز افسران اور ملازمین ان کی مالی امداد کرتے اور ان کی مشکلات کو دور کرتے اور ہر طریقہ سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے بقول سرسید احمد خاں "اکثر حکام اور فوج کے افسران نے اپنے ماتحتوں سے مذہبی گفتگو شروع کر دی تھی۔ بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے

---

[۱] موسیو گارساں دتاسی، خطبات ص ۸۵۶، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء

[۲] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۱۸۸

[۳] خطبات گارساں دتاسی ص ۱۸

تھے کہ ہماری کوٹھی پر آکر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔[1]

۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں یتیم بچوں کو سرکاری سرپرستی میں عیسائی بنایا گیا جو بقول سرسید احمد خاں تمام اضلاع مغربی وشمالی میں گورنمنٹ کے ارادہ کا نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح مفلس اور محتاج کرکے اپنے مذہب میں لے آئیں گے[2] نوبت یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ ۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ نے دارالامارات کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس خطوط بھیجے جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک ہونا چاہیے اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ ایک مذہب عیسائی ہوجاؤ۔[3]

مسیحی مبلغوں نے سرکاری مراکز، افسران کی کوٹھیوں اور گرجا گھروں سے زیادہ کاروباری مراکز، بازاروں، میلوں اور اجتماع گاہوں کا رخ کیا جہاں ہندوستانی عوام کی بڑی تعداد جمع ہوتی۔ بقول گارساں دتاسی "مسیحی مبلغین اپنا مذہبی جوش میلوں کے موقع پر ظاہر کرتے ہیں، ہندوستانیوں کے جم غفیر میں وہ اپنے خیمے لگا لیتے ہیں۔ تقریریں اور وعظ کہتے ہیں۔ رسالے تقسیم کرتے ہیں"[4]

یہ مبلغین صرف عیسائیت کے پرچار اور انجیل کی تعلیم پر اکتفا نہ کرتے بلکہ دوسرے مذاہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقامات کو بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہونچتی تھی۔[5]

اعتراف کرنا چاہیے کہ عیسائی مبلغین جو کام اپنی انتھک محنت کے باوجود مسلمانوں میں نہ کرسکے وہ مغربی علوم اور انگریزی تہذیب نے درس گاہوں کے ذریعہ کرکے دکھا دیا۔ ملحدانہ خیالات اور باطل افکار و نظریات بھی مسلم معاشرہ میں داخل ہونا شروع ہوگئے، اور اس کا نشانہ وہ نوجوان بنے جو سرکاری درس گاہوں میں

---

[1] اسباب بغاوتِ ہند ص۱۲۲ [2] ایضاً [3] ایضاً ص۱۲۹

[4] خطبات گارساں دتاسی ص۵۰۲

[5] اسباب بغاوت ہند ص۱۲۳

تعلیم حاصل کر رہے تھے، چنانچہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، فرائڈ کی جنسی تعلیم، ہیگل اور مارکس کے اشتراکی نظریات انہی راستوں سے در آئے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شدید طور پر متاثر کیا۔ آزاد خیالی، آوارہ مزاجی، مذہبی تشکیک، ملحدانہ خیالات، مذہب بے زاری ان کی پہچان بننے لگی، یہاں تک کہ ان نوجوانوں کا ایک طبقہ اس حد تک بڑھا کر مذہبی عقائد و اعمال اور مذہبی اشخاص کا مذاق اڑانے لگا۔ اس کے اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یعنی انگریز مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہوئے تو ان کو خالص مسلمان بھی رہنے نہیں دیا۔ انگریزوں کو بعض ایسے مسلمان بھی میسر آ گئے جنھوں نے اسلامی عقائد اور تعلیمات کی ایسی تعبیریں اور توجیہیں کیں جن کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں راسخ العقیدگی کی جگہ مذہبی تشکیک پیدا ہونے لگی۔

تعلیمی اثرات

مسلمانوں کا نظام تعلیم جو صدیوں سے ان کی ذہنی و فکری اور علمی تعمیر کر رہا تھا اور جو ان کی تہذیب، مذہب، تاریخ اور عقائد و احکام پر مشتمل تھا انگریزوں کے آنے کے بعد بری طرح متاثر ہوا، انگریز اپنے ساتھ جو نظام تعلیم لائے تھے اس کا نفاذ اسی وقت ہو سکتا تھا جبکہ مسلمانوں کا نظام تعلیم ختم ہو جائے۔

چنانچہ وہ مدارس جن سے علماء، فقہاء، قاضی، صدر الصدور، مفتی اور محدث پیدا ہوتے تھے یا تو سرپرستی سے محروم ہوئے، یا سکون و اطمینان سے محروم ہوئے یا بغاوت کے بعد منہدم کر دیئے گئے اور جو بچے وہ کس مپرسی کا شکار ہوئے۔ ممتاز دانش ور عبداللہ یوسف علی نے ان درس گاہوں کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> "ان انقلابات کی وجہ سے جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی مطلع کو تاریک کر دیا تھا ہندو اور مسلمانوں کی درس گاہوں کو سخت نقصان پہونچا، اس نقصان کی دو صورتیں تھیں۔ بہت سی صورتوں میں یہ درس گاہیں پبلک عطیات سے محروم ہو گئیں لیکن عطیوں کے نقصان سے زیادہ اس امن و اطمینان

کا فقدان تھا جو شاگرد اور استاذ دونوں کے دماغی مشاغل کے لیے
ضروری ہے.... اسلامی مکتبوں اور درس گاہوں کو اور بھی نقصان
پہونچا، کیونکہ ان کا براہِ راست ان حکومتوں سے تعلق تھا جن کے
اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا۔"[۱]

انگریزوں نے اسلامی مدارس اور تعلیم کی ہر ممکن حوصلہ شکنی کی، اس کے پیچھے یہ ذہن بھی کارفرما تھا کہ اگر یہ سوتے خشک ہو جائیں تو اسلامی تہذیب خود بخود کمزور ہو جائے گی اور انگریزی اقتدار، تہذیب اور مذہب آسانی سے پھیل سکے گا۔ انگریز جس نظام تعلیم کو رائج کر رہے تھے گو کہ وہ، طبیعیات، جغرافیہ، سماج، تاریخ اور ریاضی جیسے مضامین پر مشتمل تھا مگر اس کی اساس اور ماحول مسیحی مذہب تھا اس لیے مسلمان اس نظام تعلیم سے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ گارساں دتاسی نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے۔

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف
مشن اسکولوں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس
کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں۔ مسلمانوں
کو خاص کر اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے بچوں کو ان مدارس
میں بھیجنے سے احتراز کرتے ہیں اس لیے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہبِ
اسلام کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں"۔[۲]

ایک دوسرے موقع پر مستشرق دتاسی نے خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ "حکومت کی جانب سے ہندوستانیوں کے لیے جو مغربی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اس کا اثر بھی مذہب کے نشر و اشاعت میں بہت مدد دے رہا ہے۔[۳]

علامہ فضل حق خیر آبادی نے لکھا ہے کہ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے ملک کے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں

---

[۱] انگریزی عہد میں مسلمانوں کے تمدن کی تاریخ ص۹
[۲] خطبات گارساں دتاسی، ص۳۰۸ [۳] ایضاً

ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب برپا کرے گا۔ اس لیے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لیے ہر طرح کے مکرو فریب سے کام لینا شروع کیا، انھوں نے بچوں اور نا فہموں کی تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے پچھلے زمانہ کے علوم و معارف اور مدارس کو مٹانے کی پوری کوشش کی۔[1]

سرکاری مدارس کے سلسلہ میں مسلمانوں کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ یہ مدارس و مکاتب صرف عیسائی بنانے کے لیے کھولے گئے ہیں وہ گورنمنٹ کے ارادہ کو سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مذہبی علوم کو ختم کردے تاکہ آئندہ عیسائی مذہب پھیل جائے۔[2]

۱۸۰۰ء میں سر چارلس ووڈ نے ہندوستان میں انگریزوں کے نظام تعلیم کے سلسلہ میں ایک مراسلہ لکھا جو آگے چل کر انگریزی تعلیم کا منشور اعظم بن گیا۔ ۱۸۸۲ء میں ہنٹر تعلیمی کمیشن قائم ہوا جس نے انگریزی نظام تعلیم کی افادیت کا جائزہ لیا اور ووڈ کے نقطۂ نظر کو مؤثر طور پر نافذ کرنے کے لیے تجاویز مرتب کیں۔ ووڈ نے اپنے مراسلہ میں مغربی طرز کی تعلیمی پالیسی نافذ کرنے اور صرف انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا۔[3]

۱۸۳۵ء میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ جس قدر رقوم مقاصدِ تعلیم کے لیے مخصوص ہیں وہ صرف انگریزی تعلیم پر خرچ ہونی چاہیے۔[4] اس نے مشرقی زبان اور علوم کی تعلیم کو مجروح اور متاثر کیا۔ ۱۸۵۴ء میں سارے ہندوستانیوں کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک عام نصاب تعلیم بنایا جائے جس کے ذریعہ مغربی علوم کو رائج کیا جائے اور ہر صوبہ میں لفٹننٹ گورنر کے ماتحت ایک محکمۂ تعلیم قائم کیا گیا۔[5]

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۱۴

[2] اسباب بغاوت ہند ص ۱۲۵

[3] Modern Indian History p.276 New Delhi, 1963.

[4] عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ۲۵

[5] خطبات گارساں دتاسی ص ۵۵

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ فی نفسہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کے مسلمان مخالف نہ تھے کیونکہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فتویٰ دے چکے تھے کہ انگریزی کالج میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب سب درست ہے [۱] مگر حکومت کی تعلیمی پالیسی بالخصوص عیسائیت کی ترویج کے پیش نظر مسلمان کنارہ کش اور محتاط تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۶۸ء میں بنگال میں یونیورسٹی کی ڈگری کے لیے پندرہ سو ہندوستانی طلباء اور چار سو سینتالیس (۴۴۷) دوسرے طلباء امتحان دینے گئے وہ سب ہندو تھے ان میں مسلمان نام کو نہ تھا [۲] مگر معاشی مجبوریوں نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کو سرکاری مدارس میں جانے پر آمادہ کر دیا اور ۱۸۶۹ء میں سرکاری مدارس میں تعلیم پانے والے مسلمان طلباء کی تعداد ۹۰ ہزار تھی جبکہ ہندوؤں کی تعداد ۳۰ لاکھ تھی [۳]

اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزوں نے جو تین یونیورسٹیاں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں قائم کیں ان میں مشرقی علوم کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں صوبہ شمال مغربی کے باشندوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے نام ایک درخواست بھیجی کہ جس طرح یونیورسٹی مغربی علوم کی سند دیتی ہے اسی طرح مشرقی علوم کی بھی سند دے، مگر اس درخواست کو یونیورسٹی نے نامنظور کر دیا۔ چنانچہ اپیل کنندگان نے فیصلہ کیا کہ مشرقی علوم کی تدریس کے لیے وہ الگ سے یونیورسٹی قائم کریں گے۔ [۴]

جو مسلمان انگریزی درس گاہوں میں گئے وہ مغربی علوم سے بہرہ ور ہو کر سرکاری ملازمتوں کے اہل ضرور ہوئے اور ان کو معاشی آسودگی بھی ملی مگر اسلامی تہذیب و ثقافت سے ان کا رشتہ کمزور پڑ گیا جو قوم اپنے مذہب اور تہذیب سے ناواقف ہو جائے وہ اس کی حفاظت اور اشاعت بھی نہیں کر سکتی چنانچہ ایسا ہی کچھ ان کے ساتھ ہوا۔ مولانا مودودی ان حضرات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۱؎ اسباب بغاوت ہند ص ۱۲۷

۲؎ خطبات گارساں دتاسی ص ۵۵۲

۳؎ ایضاً ص ۸۰۳

۴؎ ایضاً ص ۶۷۹

"کم و بیش ۹۰ فی صدی لوگوں پر اس تعلیم کے وہی اثرات ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اسلامی تعلیم سے وہ قطعی کورے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کو ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے، اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز ان کی نظروں سے نہیں گذری...... وہ مسلمان ہونے پر نہیں ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اہلِ فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ لباس میں، معاشرت میں، کھانے اور پینے میں، میل جول اور بات چیت میں۔ حتیٰ کہ اپنے ناموں تک میں وہ ان کا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں۔" [1]

سرکاری درس گاہوں کے علاوہ خود مسلمانوں کے زیرِ انتظام بھی انگریزی تعلیم کی متعدد درس گاہیں قائم ہوئیں جہاں مغربی علوم کے ساتھ دینی تعلیم کا بھی کسی قدر لحاظ رکھا گیا اور بلا شبہ ان درس گاہوں نے مسلمانوں کی جدید تعلیم اور ذہنی تعمیر کا بڑا کام کیا، معاشی کفالت میں بڑی مدد دی، سماجی زندگی کی تشکیل میں نیا مواد فراہم کیا مگر چونکہ نظامِ تعلیم، غالب مضامین، درس گاہوں کا ماحول، مزاج اور اندازِ تدریس سب کچھ انگریزی درس گاہوں پر منحصر تھا اس لیے ان میں بھی وہ اثرات پیدا ہوئے جو اسلامی تہذیب کے لیے منفی حیثیت رکھتے تھے۔ ممتاز ماہر تعلیم سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۳۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں مسلمانوں کی مغربی تعلیم کے نصب العین، نظام اور اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"اس نظامِ تعلیم کے پیشِ نظر ظاہر ہے یہی ہو سکتا تھا کہ نوجوان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں، سرکاری ملازمت حاصل کریں۔ اپنا پیٹ پالیں، معاشرت میں مغربی نمونوں کی بھلی بری نقل اتار سکیں۔ مذہب کے سرے سے منکر تو نہ ہوں مگر اس کی حیات بخش اور زندگی پرور قوت سے محروم رہیں تو حرج نہیں، سیاست کے جھگڑوں سے الگ تھلگ رہیں۔ شخصی مفاد کی خاطر قوم کا نام لینے کی ضرورت پڑی تو

---

[1] تحریک آزادی ہند اور مسلمان

یہ ہنر زمانہ خود سکھا دے گا.....

ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لیے بنائے اور ان میں اپنی قوت اور وقت اور وسائل کا جو صرف کثیر نصف صدی سے زیادہ سے کیا ان کو دیکھیے۔ کیا انھوں نے بھی اسی نصب العین کی خدمت انجام نہیں دی؟ اکبر مرحوم نے تعلیم یافتہ آدمی کی زندگی کا جو خلاصہ کیا ہے بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے۔ کیا وہ ہمارے ان ملّی اداروں کے تعلیم یافتوں پر بھی صادق نہیں آتا، ہم کس معنی میں انھیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں"۔[1]

بایں ہمہ یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ جدید تعلیم نے مسلم ثقافت پر مثبت اثرات بھی مرتب کیے جن میں تحقیق و تنقید کے جدید منہاج، سوچ اور فکر کے سائنٹفک اسلوب، علوم میں مہارت کی نئی تکنیک اور جمہوری طرز انتظام کے ساتھ مشرقی علوم کی کتابوں اور نوادرات کی کھوج اور تلاش، ان کا جمع کرنا ان سے استفادہ کو سہل تر بنانا وغیرہ شامل ہیں۔ مسلم ثقافت میں علمی جمود کو توڑنے اور ان میں حرکت و جوش پیدا کرنے میں ان عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

لسانی اور ادبی اثرات

مسلمانوں کی سرکاری اور ادبی زبان فارسی تھی، انگریزوں نے اس کو ختم کر کے انگریزی کو سرکاری زبان بنایا۔ فارسی زبان کی حیثیت کم ہوتے سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر جو اثر پڑا اس سے زیادہ علمی اور ثقافتی تدریس اور تحریک پر برا اثر پڑا، جب کسی قوم کی زبان کاٹ دی جائے تو اس کی تہذیبی سرگرمیاں محدود و متاثر اور پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ صدیوں کا علمی اور تہذیبی سرمایہ جو اس زبان سے متعلق تھا۔ سرپرستوں، محافظوں اور قدردانوں کی کمی کے باعث قصۂ پارینہ ہو کر رہ گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فارسی کی جگہ اردو زبان نے لی اور بعض انگریز افسران

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین، تعلیمی خطبات ص ۴۴ نئی دہلی ۱۹۷۴ء

اور دانشوروں نے اس کی ترویج و ترقی میں دلچسپی لی جن میں جان گلکرسٹ وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ مگر اول تو یہ سرکاری زبان نہ تھی۔ دوم یہ کہ اردو میں علمی اور تہذیبی سرمایہ کا ذخیرہ نہ تھا اس لیے وہ فارسی کی جگہ نہ لے سکی۔ بعد میں اردو مصنفین علماء اور اسکالرس نے ضرور اس کو علمی زبان بنانے میں بڑی کوشش کی، لیکن اس زبان میں عربی و فارسی کے جو الفاظ تھے اور جن کی بنا پر اردو علمی اور تہذیبی زبان بنی انگریز یہ کوشش کرتے رہے کہ ان الفاظ اور اصطلاحوں کو نکال دیا جائے اور ان کی جگہ انگریزی اور ہندی کے الفاظ استعمال کیے جائیں تاکہ مسلمانوں کی حکومت اور ثقافت کے اثرات ختم ہو جائیں۔ گارساں دتاسی نے سرچارلس ٹریولین کے متعلق لکھا ہے۔

"وہ چاہتے ہیں کہ عربی و فارسی کے متعلق الفاظ جو مسلمان فاتحین کے اثر سے ہندوستانی زبان میں داخل ہو گئے ہیں، اس زبان سے خارج کر دیے جائیں اس لیے کہ ہندی کے ایسے الفاظ کثرت سے موجود ہیں جو بآسانی ان عربی و فارسی لفظوں کی جگہ لے سکتے ہیں۔ سرچارلس ٹریولین نے مجھے لکھا ہے کہ ہندوستانی زبان میں آج کل یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ انگریزی کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کیا جائے۔ اس رجحان سے ہندوستانیوں اور انگریزی قوم کے موجودہ تعلق کا پتہ چلتا ہے"۔[1]

عربی و فارسی الفاظ کی مخالفت انگریزوں کے ساتھ ہندو بھی کر رہے تھے، بلکہ ان کی تحریک زیادہ تعصب اور عناد پر مبنی تھی۔ بقول دتاسی ہندوؤں کی عام طور پر یہ خواہش ہے کہ عربی و فارسی کے عنصر سے قطعی احتراز کیا جائے، بلکہ بعض ہندو ایسے بھی ہیں جو لاطینی رسم خط کو اردو رسم خط پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے دلوں میں اسلامی حکومت کی مخالفت کے باعث پیدا ہوئی ہے۔[2] انگریزی حکومت ہندوؤں کے ساتھ تھی اور اسلامی تہذیب کے آثار مٹانے کے لیے وہ بھی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ مستشرق دتاسی کے بقول "برطانوی حکومت اس تحریک کے موافق معلوم ہوتی ہے۔ حکومت کا خیال ہے کہ ہندی کی موافقت سے ہندو

---

[1] خطبات گارساں دتاسی ص۱   [2] ایضاً ص۵۹

لوگ خوش ہو جائیں گے اور چونکہ ہندوستان کی آبادی کی کثرت انہی پر مشتمل ہے اس لیے ہندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی ہے[۱]

اخلاقی اور تہذیبی اثرات

جس طرح انسان کے قویٰ اور اعضاء کمزور پڑتے ہیں تو مختلف قسم کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں، اسی طرح جس قوم کی معاشی حالت کمزور ہوتی ہے اور تعلیم کا نظام بگڑ جاتا ہے تو اس کا اثر اس کی اخلاقیات پر بھی پڑتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ "غریبی کفر کے قریب ہے" تو اس میں بڑی سماجی بصیرت اور دانائی چھپی ہوئی ہے، ہندوستان میں بھی اقتصادی بحران اور متوازن تعلیمی نظام کے فقدان کا اثر مسلمانوں کی اخلاقی اور تہذیبی زندگی پر پڑا اور ان میں مختلف قسم کے اخلاقی اور سماجی عیوب ظاہر ہوتے لگے۔

عوام میں اخلاقی خرابیاں جڑ پکڑتی ہیں تو ان کا ازالہ دو طریقوں سے ہوتا ہے: ایک مذہب دوسرا قانون۔ مذہب دعوت و تبلیغ، وعظ و تلقین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ ایک عام اخلاقی ماحول پیدا کرتا ہے۔ برائیوں کی طرف مائل ہونے والے خود کو معاشرہ میں اجنبی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس سے برائیاں کمزور پڑتی ہیں، ان کی عام اشاعت نہیں ہوتی۔ دوسری طرف نظامِ قانون تعزیرات اور سزاؤں کے ذریعہ ان خرابیوں پر روک لگاتا ہے، جس سے نہ صرف مجرموں کے حوصلے پست ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہوتی ہے۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے وقت یہ دونوں عوامل کمزور پڑ گئے تھے، اور انگریزی عہد میں صورتِ حال اس حد تک پہونچ چکی تھی کہ سر ہنری اسٹریچی کو کہنا پڑا:

"لوگ پہلے کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ شہوت پرست ہو گئے ہیں، عیاری، دروغ حلفی، دھوکا اور جھوٹ کے خصائل رذیلہ یقیناً زیادہ عام ہو گئے ہیں شراب خوری، بدچلنی، بداخلاقی، شہدا پن کے اخلاقی عیوب ایسے نظامِ حکومت میں لازمی طور پر

۱؎ خطبات گارساں دتاسی

بڑھ گئے جو اگرچہ اسلامی قانون کو کام میں لانے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن ان بداخلاقیوں کی پاداش میں ملزم کو سزا نہیں دیتا..... میرے پاس اس امر کو باور کرنے کے لیے وجوہ موجود ہیں کہ کلکتہ میں قانون کا نظام جو ہم نے قائم کیا ہے اس سے لوگوں کے اخلاق زیادہ خراب ہو گئے ہیں"۔[1]

دوسری طرف جو لوگ معاشی خوش حالی کی تلاش میں انگریزی اور سرکاری تعلیم گاہوں کی طرف گئے تھے ان سے ان کو تعلیم جدید اور ملازمت و معاشی تحفظ کا سامان تو ملا مگر مذہبی تعلیم و تربیت سے محرومی کے باعث وہ مغربی تعلیم کے ان مضر اثرات سے خود کو نہ بچا سکے جو تہذیبی اور اخلاقی لحاظ سے ان برادران کے خاندان پر پڑے۔ مسلم معاشرہ پر اس کے جو دور رس اثرات پڑے ان پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا مودودی نے بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں کہا تھا۔

"ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں گذری ہے اور حال یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے زیادہ نفس پرست، بندۂ شکم اور آسائش بدن کی غلام بن کر اٹھ رہی ہے۔ ستر برس سے پہلے وہ مغربی تعلیم کی طرف یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہم صرف اپنی مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ادھر جا رہے ہیں، اپنے دین و اخلاق اور اپنی قومی تہذیب و تمدن کو ہم کھونا نہیں چاہتے..... لیکن وہ بنیادی کمزوریاں جنھوں نے ان کو حکومت کے منصب سے ہٹایا تھا ان میں پہلے سے موجود تھیں اور وہ نئی کمزوریاں جو غلامی اور افلاس کی حالت میں فطرتاً پیدا ہوتی ہیں ان کے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں، ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دین و اخلاق کی اہمیت اور قومی تہذیب و تمدن کی قدر و منزلت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی، دوسری طرف خود غرضی اور نفسانیت کے روز افزوں غلبہ نے ان کو ہر اس شخص کی غلامی پر آمادہ کر دیا جو ان

---

[1] خطبات گارساں دتاسی ص ۹۶۔۹۵

کو کچھ مال وجاہ اور اپنے ہم جنسوں میں کچھ سربلندی عطا کرسکتا ہو۔[1]

مسلمانوں کی اخلاقیات اور تہذیب پر مغربی تہذیب اور انگریزی نظام تعلیم کا دوسرا اثر بے حیائی اور بے پردگی کی شکل میں پڑا۔ پہلے تو انگریزوں نے لڑکیوں کے لیے علیٰحدہ تعلیم گاہیں قائم کیں مگر بعد میں مخلوط درس گاہوں اور مخلوط تعلیم کو رواج دیا۔ خاص طور پر ثانوی سطح پر مخلوط تعلیم جو لڑکے اور لڑکیوں کے لیے عنفوانِ شباب کا زمانہ ہوتا ہے، اخلاقی لحاظ سے شدید نقصان کا باعث ہوا۔

بے پردگی اور بے حیائی مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں عام ہوئی اور عفت و عصمت اور شرم وحیا کی اسلامی قدریں پامال ہوکر رہ گئیں۔ انگریزی نظام تعلیم کے لیے پرکشش کا ذریعہ تھی اس لیے تعلیم پہلے بے پردگی پھر برہنگی سے جڑ گئی۔ اس مخلوط تعلیمی ماحول میں لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ، جملے بازی اور جنسی بے راہ روی عام سی چیز بن گئی یہاں تک کہ وہ ادارے بھی اپنے بچے اور بچوں کو جنسی بے اعتدالی سے نہ بچا سکے جن کو خود مسلمانوں نے قائم کیا تھا۔ ماہر القادری نے ان لڑکیوں کو مخاطب کرکے کہا تھا ؎

الجھیں ترے رخسار سے گستاخ نگاہیں
تو اور ہو مجروح تماشا مرے آگے

اب تو عالم یہ ہوگیا ہے کہ مغربی تعلیم یافتہ سوسائٹی میں بے پردگی روشن خیالی اور پردہ نشینی رجعت پسندی تصور کی جاتی ہے، آزادئ نسواں، حقوقِ نسواں اور مساواتِ مردوزن کے دلفریب نعروں نے مسلم معاشرہ کو ایک عجیب کشمکش اور تناؤ میں مبتلا کردیا ہے جس کا ۱۲ صدیوں تک کوئی چرچا نہ تھا۔ حالانکہ اسلام کے عطاکردہ حقوق، خواتین کو اس سے زیادہ وقار، اعتبار اور عظمت عطا کرتے ہیں جو مغربی تہذیب عطا کرنے کی دعوے دار ہے، چنانچہ مغربی تعلیم آزادئ نسواں کی جگہ آوارگئ نسواں کی محرک بن گئی۔

المیہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ بعد

---

[1] تحریک آزادئ ہند اور مسلمان ۱/۴۵

میں یہ احساس مسلمانوں میں عام ہوا تو لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں قائم ہوئیں جن میں دینی علوم اور عصری علوم کا امتزاج رکھا گیا اور دینی اور عصری علوم کی الگ الگ درس گاہیں بھی قائم ہیں۔

علماء کی تحریکِ مزاحمت

برطانوی حکومت کے ظلم و استحصال، مذہبی و تہذیبی جارحیت اور مغربی نظامِ تعلیم کے مذکورہ اثرات نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور ان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر وہ اپنی تہذیب و ثقافت اور مذہبی وراثت کی حفاظت کے لیے خود کمربستہ نہیں ہوں گے تو ہندوستان میں ان کا وجود بے معنی ہو کر رہ جائے گا، چنانچہ سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی ہر سطح پر انگریزوں کے اثرات ختم کرنے کا مسلمانوں میں جذبہ پیدا ہوا، پھر مزاحمت اور مقابلہ کی ان میں وہ تحریکیں پیدا ہوئیں جن کے سبب اسلامی تہذیب کا مستقبل روشن ہوا، بقول اقبال۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے موجوں ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

انگریزوں کے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کے درمیان شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے افکار پر قائم جماعت موجود تھی، جن میں سید احمد شہید بریلویؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، مولانا فرحت حسینؒ، مولانا عبدالحیؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حافظ ضامن شہیدؒ، مولانا ولایت علیؒ، مولانا عنایت علیؒ، مولانا احمد اللہؒ، مولانا عبداللہؒ، مولانا شاہ محمد حسینؒ، مولانا جعفر تھانیسریؒ، اور مولانا کرامت علی جون پوریؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں[1] یہ گروہ اور ان کے ہزاروں جانثار ۱۸۶۴ء تک انگریزوں کے خلاف مورچہ سنبھالے رہے اور جگہ جگہ کیمپ لگا کر انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد کچھ عرصہ تک جہاد کی تحریک کمزور رہی اور اسلام کے سپاہی مقدمات، سزاؤں اور تعزیروں کا سامنا کرتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا محمود حسن دیوبندی کی انگریزوں کے خلاف ریشمی رومال

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک' از مولانا مسعود عالم ندوی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ نیز دیکھئے مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب تواریخ عجیب (کالا پانی) نیز مولانا غلام رسول مہر کی کتاب سرگزشتِ مجاہدین۔

تحریک ناکام ہوئی۔ اور مولانا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مالٹا میں قید کیے گئے[۱] پھر مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو ملک بدر کرنے کی تحریک شروع کی جو بالآخر ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی پر منتج ہوئی۔

دوسری طرف علماء کرام کی بڑی تعداد عیسائی پادریوں اور مبلغوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ ہوئی اور جگہ جگہ مناظرے کرکے اور کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ ان کے اثرات ختم کرنے پر کاربند ہوئی۔ ہندوستان میں عیسائیت کے خلاف علماء اسلام کی تحریک مزاحمت ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

عیسائی مبلغین اور انگریز افسران یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہندوؤں کو بآسانی عیسائی بنا سکتے ہیں مگر مسلمان آسانی سے عیسائیت نہیں قبول کر سکتے کیونکہ وہ خود مضبوط عقیدہ اور روشن تعلیمات کے حامل ہیں چنانچہ انھوں نے مسلمانوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے رسالوں اور کتابوں کا سلسلہ شروع کیا اور مسلمانوں کو مناظرے کی دعوت دی۔ ایسے ہی ایک مناظرہ کی بابت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے پادری کو لکھا کہ اگر آپ واقعی دل سے حق کے طالب ہیں تو آپ کو کسی محمدی عالم کا نام بتا دیا جائے گا اور اگر ہار جیت ہی مقصود ہے تو غریب مسلمانوں کو اس عنایت سے معاف رکھئے[۲]

ابتداء میں علماء اسلام نے عیسائی پادریوں کی دعوتِ مناظرہ کو نظر انداز کیا مگر جب انھوں نے اسے مسلمانوں کی کمزوری سمجھا تو علماء نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ ان اعتراضات کے جواب دیے جو اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام پر وارد کیے جارہے تھے اور ان کے دلائل کا توڑ کیا۔ اس طرح عیسائی مبلغوں کی پیش قدمی کو روکا، مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ کو خراب ہونے سے بچایا اور آگے بڑھ کر عیسائیوں کو قبولِ اسلام کی دعوت دی۔

عیسائیوں سے مناظرہ کی شروعات خود شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا سید محمد میاں، تحریک شیخ الہند، الجمعیۃ پریس۔ دہلی

[۲] فتاویٰ امدادیہ ۴/ ۱۳۵

کی۔ جو پادری اسلام کے متعلق اعتراضات کرتا مولانا اس کے مسکت جواب دیتے[۱]
اس عہد میں عیسائیوں سے مناظرہ کرنے والے اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے والے مصنفین اور علماء کی بڑی تعداد ہے ان میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر خاںؒ۔ مولانا آل حسنؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ مولانا ابوالمنصور دہلویؒ، مولانا شرف الحقؒ اور مولانا محمد علی مونگیریؒ کے نام نمایاں ہیں[۲]

مسلمان محکوم اور شکست خوردہ تھے۔ اپنے معاشی مسائل میں الجھے ہوئے تھے اور عیسائی پادری خوش حال تنخواہ دار اور حکومت کی پشت پناہی میں تھے۔ پھر بھی ان علماء نے تقریر و تحریر دونوں محاذ پر ان کا بھرپور مقابلہ کیا اور ہندوستان کو نصرانی مملکت بنانے کا خواب پورا ہونے نہ دیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں میں حرکت و بیداری اور عزم و حوصلہ کی نئی لہر پیدا کر دی جب بھی کسی مناظرہ میں پادری کو شکست ہوئی تو مسلمانوں میں فتح کا سرور چھا جاتا۔ دینِ اسلام سے وابستگی مضبوط تر ہو جاتی۔ اور سیاسی محکومی کا غم کم ہو جاتا۔

عیسائیت کی تردید میں اردو زبان میں پہلی کتاب "خلاصۃ صولۃ الضیغم علی اعداء ابن مریم" مولوی عباس علی جاجموی نے لکھی اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ

> "قدیم عہد میں ردِ نصاریٰ کا عمل نہ تھا اور زور و شور اس دین کے منسوخ ہونے کا پنہاں تھا۔ اگلے عالموں نے ان کے رد کی طرف کم توجہ دی۔ لیکن اس زمانہ کے عالموں پر فرض ہے، واجب ہے کہ اس دین کے ابطال پر کوشش کریں۔ ورنہ رفتہ رفتہ یہی لوگ خلق کثیر کو گمراہ کر ڈالیں گے۔ یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ رد لکھنے سے کفار قائل نہیں ہوتے پھر کیا فائدہ؟ کیونکہ جب میں صولۃ الضیغم لکھ چکا اور دس پانچ جگہ یہ امر مشہور ہو گیا تو لوگوں نے ویٹ اور ولیم پادریوں کی مجھ سے بحث کرا دی، آخر میں خدا کی مدد سے ان پر غالب ہوا تب

---

[۱] مولانا امداد صابری، فرنگیوں کا جال، ص ۲۲۵، دہلی ۱۹۴۹ء

[۲] ایضاً ص ۲۲۲ عیسائیوں سے مناظرہ کرنے والے علماء کی فہرست مولانا امداد صابری نے تفصیل سے بیان کی ہے

ان کے رفیقوں میں سے جو نئے نئے عیسائی ہوئے ہیں دو شخص میرے پاس آکر مسلمان ہو گئے [1]

گارساں دتاسی نے ۱۸۶۸ء میں فرانس میں خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا: "مسلمان لوگ خاص کر اس آزادی (تبلیغ) سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں چنانچہ دہلی کے گلی کوچوں میں ان کے واعظ جلسے منعقد کرتے ہیں اور اپنے دین کی حمایت میں مسیحی مشنریوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں اور اپنے مذہب کی فضیلت ثابت کرتے ہیں" [2]

دتاسی نے مزید لکھا ہے کہ اگرچہ اس وقت مذہب اسلام کی پشت پناہی پر فاتح قوم کا تعصب کام نہیں کر رہا ہے لیکن اسلام بمقابلہ ہندو دھرم کے زیادہ اشاعت حاصل کر رہا ہے۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۶۶ء کے اخبارِ عالم میں میری نظر سے یہ خبر گذری کہ ایک شخص نے جس کا نام حاجی محمد ہے، پنجاب میں دو لاکھ ہندوؤں کو زمرہ اسلام میں شامل کر لیا ہے، ایک وہابی اور اس کے چند شاگرد دکن میں اسلام کی تبلیغ کر رہے ہیں، وہابیوں کی ایک بڑی جماعت پونا احمد نگر میں بھی ہے۔ حیدر آباد دکن میں ان کا ایک بڑا گروہ موجود ہے [3]

علماء اسلام کی ان دعوتی کوششوں کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ مسلمانوں پر مشنریز کی کوششیں غیر موثر ہو کر رہ گئیں اور معدودے چند مسلمان ہی جہالت اور ناداری کا شکار ہو کر مرتد ہو سکے۔ بقول دتاسی "ہندوستان میں ان مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم ہے جنھوں نے مسیحی مذہب قبول کیا" [4]

دوسرا نتیجہ یہ نکلا غیر مسلم حضرات کو جن میں ہندوؤں کے علاوہ مسیحی بھی شامل ہیں اسلام کی دعوت کو سننے سمجھنے اور اپنے مذاہب سے موازنہ کرنے کا موقع ملا جس کے سبب وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ عیسائیوں کے قبولِ اسلام پر حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے گارساں دتاسی نے ۱۸۶۹ء میں کہا تھا:۔

"یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو لوگ زمرۂ اسلام میں

---

[1] فرنگیوں کا جال ص۱۲۹
[2] خطبات گارساں دتاسی ص۶۶۳
[3] ایضاً ص۵۷۱
[4] ایضاً ص۶۶۳

شامل ہو رہے ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض عیسائی لوگ نہ معلوم کیوں اسلام قبول کر لیتے ہیں..... اردو کے ایک اخبار "چشمۂ علم" میں ان غریب یورپینوں کے قبولِ اسلام کے حالات بیان کیے گئے ہیں. یہ محتاج لوگ مدراس کی ایک مسجد میں جمع ہوئے اور قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا۔ بعض دوسرے یورپینوں کا ارادہ تھا کہ اسلام قبول کر لیں اور مکہ حج کے لیے جائیں..... ایک سوئزرلینڈ کے باشندے نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اب وہ مشرقی لباس زیب تن کیے بندیل کھنڈ میں تبلیغ کرتا پھرتا ہے[۱]

[۱] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۸۱

اسلامی نظام معاشرت پر اعتراضات کا مسکت جواب

مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ

مولانا سید جلال الدین عمری

اس کتاب میں اسلام میں عورت کے مقام و مرتبہ پر مخالفین کے اعتراضات کا علمی جائزہ لیا گیا ہے اور بہت مدلل انداز میں ان کا رد کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسلام کے زیر سایہ عورت کو حاصل حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں مہر نفقہ، تعدد ازدواج، طلاق، نفقۂ مطلقہ، خلع، حجاب، وراثت، قصاص، دیت، شہادت، خاندان کی سربراہی اور سیاسی قیادت جیسے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ مصنف نے بدلائل واضح کیا ہے کہ ان تمام مسائل میں اسلام نے عورت کی مخصوص جسمانی صلاحیت اور طبعی رجحانات و میلانات کی بھرپور رعایت کی ہے اور اس کے حقوق اور ذمہ داریوں میں توازن رکھا ہے۔ تیسرا ایڈیشن۔ صفحات ۲۰۰۔ قیمت ۶۰ روپے

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی نے The Rights of MUSLIM WOMAN - An Appraisal کے نام سے شائع کیا ہے۔ صفحات: ۲۲۴ قیمت ۷۰ روپے

اس کا ہندی ترجمہ بھی اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

ملنے کے پتے

(۱) ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ۔ ۱

(۲) مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ ابوالفضل انکلیو۔ نئی دہلی۔ ۲۵

بحث و نظر

نصابِ زکوٰۃ کی تعیین
چند اُصولی مباحث

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ذیل کے مقالہ میں نصابِ زکوٰۃ سے متعلق بعض اہم سوالات مقاصدِ شریعت، قیمتوں کے فرق اور حالات کی تبدیلی کی روشنی میں اٹھائے گئے ہیں اور اہلِ علم کو ان پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اسے ایک نقطۂ نظر کے طور پر یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ اس پر سنجیدہ اور علمی اسلوب میں اظہارِ خیال کے لیے سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ کے صفحات حاضر ہیں۔ —— (جلال الدین)

شریعتِ اسلامی کے ہر قانون و اصول کے پیچھے ایک حکمتِ الٰہی کارفرما ہوتی ہے۔ اور اس حکمتِ الٰہی کا تعلق بندگانِ الٰہی کے مصالح و مفادات کی رعایت و پاس کرتا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ پورے اسلامی معاشرے کی بہتر سے بہتر فلاح و صلاح کا اجتماعی مقصود بھی وابستہ ہوتا ہے۔ جو اپنی نوعیت، وسعت اور ہمہ گیری کے سبب عام انسانی سماج کی بہبود کا ضامن بن جاتا ہے[1] (شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ؛ المکتبۃ السلفیہ، لاہور غیر مورخہ، اول ۱۱-۱۴ و مابعد مباحث)

نصابِ زکوٰۃ کی تمام اصناف میں یہی چہارگونہ یا چہار ابعادی (Four Dimens-ional) اصولِ فلاحِ بشر کارفرما ہے۔ فرمودۂ شاہ ولی اللہ دہلوی ہے کہ چاندی کا نصاب —— پانچ اوقیہ —— اس لیے مقرر کیا گیا کہ وہ اوسط خاندان (اہل بیت) کی کمترین سالانہ ضروریات کی کفایت کرتا ہے۔ یہی حکمت نقدین دو سو درہم کے نصاب میں پائی جاتی ہے اور غلہ و جنس اور مویشی کی مختلف اصناف کے نصابات میں بھی[2] (شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، دوم ۴۰-۳۹ نیز ۴۳-۴۲؛)

مال کی مختلف قسموں کے باہمی مناسب اور ان کے مختلف نصابات کے پیچھے شاہ صاحب نے ایک اصولِ حکمت تو یہی کارفرما بتایا ہے کہ ان کا اپنا اپنا نصاب سال بھر کی ضروریات کی کم سے کم کفالت کر سکتا ہے اور دوسرا اصول ان کی باہمی قیمت یا ثمنیت کو قرار دیا ہے۔ جس طرح پانچ اوقیہ چاندی دوسو درہم کی قیمت رکھتی تھی یا دو سو درہم یا پانچ اوقیہ چاندی کی قیمت کے مساوی تھے اسی طرح پانچ اونٹوں، چالیس بکریوں، تیس گایوں وغیرہ کے نصابات چاندی کے پانچ اواقی یا دوسو درہم کے برابر تھے۔ پانچ وسق غلہ یا زمینی پیداوار بھی ایک اوسط درجہ کے خاندان کی کفایت کرنے کے ساتھ ساتھ مالیتیں نقد، چاندی یا مویشی کے نصابات کے مساوی یا قریب قریب تھی۔ سونے کو چاندی پر محمول کر کے اس کا نصاب بیس مثقال مقرر کیا گیا کہ عہدِ تشریع میں ایک دینار دس درہم کے مساوی تھا اور بیس مثقال سونا بیس دینار یا دوسو درہم کے مساوی تھا۔

(شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، دوم ۴۴-۴۲: مقادیر الزکوٰۃ)

نصابِ زکوٰۃ کی تشریع نبوی پر اس حکیمانہ بحث سے چند واضح اصول و قواعد نکلتے ہیں:۔

اول: شرعی قوانین کے پابند (مکلف) مسلم کے اس مال پر کوئی زکوٰۃ نہیں مقرر کی گئی جو اس کے اوسط درجہ کے خاندان کی کم سے کم ضروریات کی ایک پورے سال تک کفالت کرے۔

دوم: ایسے مکلف مسلم کے سال بھر کے ضروری اخراجات سے جو رقم یا مال زائد ہو اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی بشرطیکہ وہ اپنے نوع و جنس کے مقررہ نصاب کو پہونچ جائے۔

سوم: ثمنِ اصلی ۔ چاندی ۔ کا نصاب مالیت میں دوسو درہم کے نقد کے برابر ہے۔

چہارم: سونے کا نصاب مالیت میں چاندی کے مساوی یا مماثل ہے۔

پنجم: نقد (کیش) کو چاندی پر محمول کیا گیا ہے اور اس کا نصاب مالیت میں چاندی کے نصاب کی مالیت کے مساوی ہے۔

ششم: زمینی پیداوار کی مالیت بھی اس کے نصاب کی تعیین میں مدنظر رکھی گئی ہے اور اس کی مالیت ثمنِ اصلی کے برابر ہے۔

ہفتم: مختلف مویشیوں کے نصاباتِ زکوٰۃ میں نہ صرف ان کی باہمی مالیت کے

برابر ہونے کا اصول مدِنظر رکھا گیا ہے بلکہ ان کی اپنی اپنی جداگانہ مالیت کو ثمنِ اصلی کی مالیت نصاب سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

ہشتم: اور نصاب کی اصولی مالیت سال بھر کی کمترین ضروریات کی کفایت ہے۔

احادیثِ نبوی، سیرتِ طیبہ، مباحثِ فقہاء، دلائلِ حکماء اور مقتضیاتِ عقل سے واضح ہوتا ہے کہ: رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمنِ اصلی میں چاندی کا نصاب مقرر فرمایا تھا۔ سونے کے نصاب — بیس مثقال — کو محدثین کرام نے صحیح احادیث پر مبنی نہیں قرار دیا ہے جیسا کہ امام شافعی سے تصریح کے ساتھ منقول ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی اور دوسرے محدثین کرام کے نزدیک وہ روایات و آثار پر مبنی یا نصابِ فضہ/ چاندی پر محمول ہے۔ بہت سے ائمہ کرام اور فقہاءِ عظام کے نزدیک حضرات عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی "صحیح حدیث" پر مبنی ہے۔ حدیثِ نبوی یا روایتِ اسلامی پر مبنی ہونے یا نہ ہونے کے اختلاف کے باوجود اس پر سب کا اتفاق ہے کہ سونے کا مقرر کردہ نصاب چاندی کے نصاب کے برابر تھا مالیت میں۔[۲۹] (بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الزکوٰۃ، باب زکوٰۃ الورق وغیرہ؛ ابن حجر عسقلانی؛ فتح الباری، متعلقہ ابواب، سوم ۹۳۔ ۳۹۱ وغیرہ؛ مجیب اللہ ندوی، اسلامی فقہ، تاج کمپنی دہلی ۱۹۹۲ء، اول ص ۲۵۲)

ایک اہم مسئلہ ہمارے علماء و فقہاء کے غور و فکر کے لیے یہ ہے کہ مدتوں سے نقدال: چاندی اور سونے کے مقررہ نصابات میں مالیت کے اعتبار سے تفاوت پیدا ہوتا رہا۔ اس تفاوت و فرق کے پیچھے قیمتوں کا اتار چڑھاؤ کارفرما ہے جس کی طرف شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ چاندی کے پانچ اوراق کے مقررہ نصاب کے سال بھر تک کمترین ضروریات کی کفایت کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اکثر ممالک میں قیمتیں موافق تھیں (... اذا کانت الاسعار موافقۃ فی اکثر الاقطار، واستقریٰ عادات البلاد المعتدلۃ فی الرخص والغلاء تجد ذالک) شاہ صاحب نے اس ضمن میں ایک اور اصول بھی وضع فرمایا ہے اور وہ ہے قیمتوں کے چڑھنے اترنے میں ممالک و بلاد کی عادات کے استقرار کا۔ عاداتِ ممالک/ رواج و رسوم چلن عام یا عرفِ علاقہ کا اصول بھی نصاباتِ زکوٰۃ کی تعیین میں پوری طرح کارگذاری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔[۳۰] (حجۃ اللہ البالغہ، دوم ۴۳)

امام بخاری نے حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کے حوالے سے چاندی، زمینی پیداوار اور اونٹ کے نصابات کی تعیین کی ہے اور دوسری احادیث نبویہ نے ان تین قسموں کی تعیینِ نصاب میں کچھ مزید توسیع کی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں بالخصوص مدینۂ منورہ میں یہی تین مال کی قسمیں تھیں جن کا نصاب متعین کیا گیا حتیٰ کہ سونا ثمنِ اصلی ہونے کے باوجود عام استعمال، چلن اور رواج کے اعتبار سے مالِ نادر تھا اس لیے اس کا نصاب چاندی کی طرح پکا تعیین نہیں رکھتا ہے۔ (بخاری، فتح الباری کے ابواب الزکوٰۃ؛)

شاہ ولی اللہ دہلوی نے غلاموں اور گھوڑوں کو عہدِ نبوی میں زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دینے کی حکمت یہ بتائی ہے کہ غلاموں کو نسل کشی کے لیے استعمال کرنے کی عادت نہ تھی اور گھوڑے اقالیم میں اتنے زیادہ نہ تھے کہ ان کو مویشیوں (انعام) کے زمرہ میں شمار کیا جاتا۔ لہٰذا ان کو "اموالِ نامیہ" نہیں سمجھا جاتا تھا جو زکوٰۃ کی فرضیت کی ایک بنیادی شرط ہے۔ ان کے علاوہ بعض دوسری اقسام پیداوار اور مویشی بھی عرب یا مدینہ میں نہیں ملتے تھے۔ لہٰذا "عادت" "رواج اور "عمومی چلن" سے خارج ہونے کے سبب ان کا نصابِ زکوٰۃ متعین نہیں کیا گیا۔[۹۴] (حجۃ اللہ البالغہ، دوم ۴۳)

ایسے تمام اموال پر زکوٰۃ کی فرضیت اور ان کی شرحِ نصاب کی تعیین کا فقیہانہ کام خلفاء کرام، صحابۂ عظام اور فقہاء انام نے قیاس کے اصول کی بنا پر انجام دیا۔ ان پر مالِ نامی ہونے کا قاعدہ جاری کیا گیا اور اس میں علاقہ، قوم کی عادت، علاقہ یا زمانہ کی روایت اور مال کی مالیت / ثمنیت کا اعتبار کیا گیا اور اس زاویہ سے اسی جنس / نوع کے مالِ نامی سے اس کو ملحق کر دیا گیا اور اصل مالِ نامی کے نصاب پر اس کو محمول کر کے قیاسی مالِ نامی کا نصاب متعین کیا گیا[۹۵] جیسا کہ سونے کو چاندی پر یا گیہوں کو جَو پر قیاس و محمول کیا گیا۔

جَو پر گیہوں کو محمول کرنے کا معاملہ اگرچہ زکوٰۃ الفطر سے متعلق ہے لیکن بہر حال اس کا ایک گونہ تعلق نظامِ زکوٰۃ ہی سے ہے۔ اس سے زیادہ اس مسئلہ میں دونوں اجناس کی باہمی قیمتوں کے اختلاف کا معاملہ واضح کرتا ہے کہ مال کی مالیت / ثمنیت نصاب کے تعیین کی وجہ بنتی ہے اور دونوں مختلف اجناس کی ثمنیت و مالیت وجہِ تناسب

قرار پاتی ہے۔ گیہوں کے نصاب یا مالیت کی تعیین میں اس کے عام استعمال اور رواج یا عادتِ بلاد کی رعایت بھی کی گئی ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ ہی کی دوسری روایت کے مطابق عہدِ نبوی میں صحابۂ کرام زکوٰۃ الفطر میں طعام یا تمر یا جو یا زبیب میں ایک صاع نکالا کرتے تھے۔ جب حضرت معاویہؓ کا زمانہ آیا اور گیہوں کا چلن ہو گیا تو انھوں نے قاعدہ مقرر کیا کہ گیہوں کا ایک مُد مذکورہ بالا اجناس کے دو مدوں کے برابر سمجھا جائے۔ چنانچہ صحابۂ کرام اور بعد کے فقہاءِ عظام نے گیہوں کی مالیت کی گرانی کے سبب اس کا نصفِ صاع زکوٰۃ الفطر کے لیے مقرر کیا۔[۹۵] (بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب صاع من زبیب؛ فتح الباری، سوم ۷۲-۴۶۹ نیز باب الصدقۃ قبل العید...؛ حجۃ اللہ البالغہ، دوم، ۴۴؛ مجیب اللہ ندوی، اسلامی فقہ اول ۱۶-۴۱۴)

حضرت معاویہ کے اصول یا قاعدہ کی اساس خالص قیاس پر مبنی ہے اور صحابہ و علماء کے اتفاق کی بنا پر اس کو اجماع کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ مگر اس ضمن میں چند اصولی مباحث و مسائل کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ جو کے بالمقابل گیہوں کی دوگنی قیمت/مالیت کے سبب قیاس کی بنا پر حضرت معاویہ نے اس کی زکوٰۃ الفطر آدھی مقرر کی اور گیہوں کو اجناس قابلِ زکوٰۃ کی فہرست میں اس لیے شامل کیا کہ اس کا رواج و استعمال ان کے زمانے میں ہو گیا تھا جبکہ عہدِ نبوی میں وہ صحابۂ کرام کی عام خوراک میں شامل نہ تھا۔ اب اگر قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے سبب جو اور گیہوں کی قیمتوں کا فرق مٹ جائے اور دونوں کی مالیت و ثمنیت برابر یا برعکس ہو جائے جیسا کہ موجودہ زمانے میں مختلف بلاد و امصار میں ہو گئی ہے تو گیہوں جو کے بالمقابل اسی طرح دوگنی قیمت کا تسلیم کیا جاتا رہے گا اور اس کی شرحِ زکوٰۃ الفطر جو کے بالمقابل نصف ہی رہے گی۔ جیسا کہ ہمارے تمام فقہاءِ احناف آج تک تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ (مجیب اللہ ندوی، اسلامی فقہ، اول ۴۱۶) اور صرف یہی نہیں بلکہ تمام اناجوں "جیسے چنا، چاول، دھان، باجرہ، جوار، مٹر، مسور، ارہر" وغیرہ سب کو نصف صاع گیہوں پر ہی قیاس و محمول کر کے اس کے حساب سے زکوٰۃ الفطر ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ حالانکہ جو کی قیمت گیہوں سے متجاوز ہو گئی ہے اور چنا، چاول اور متعدد دالوں کی قیمتیں جو سے بھی دوگنی اور تین چار گنی تک ہو گئی ہیں۔

قیمتوں کے تفاوت کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہے۔

اصل مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ — چاندی اور سونے — کی تناسبی قیمتوں میں موجود شرحوں کے مطابق لگ بھگ سات گنا تفاوت پایا جاتا ہے۔ مالِ نقد — نوٹ یا کاغذی کرنسی — کو ان دونوں اصلی ثمن میں سے کسی ایک پر محمول کرنے کا دوسرا مسئلہ ہے۔ ان ہی دونوں مسائل کا حل تلاش کرنے سے نقد مال (کیش) کا نصابِ زکوٰۃ متعین کیا جا سکتا ہے۔

فقہاء کرام کے مختلف مسالک بیان کر دینے سے یا فقراء کے لیے زیادہ نفع بخش شرح کو ترجیح دینے سے مالِ نقد کا نصاب زکوٰۃ صحیح اسلامی شریعت اور اس کی صالح روح کے مطابق مستقل طور سے طے نہیں ہو سکتا۔ فقہاء اسلام بالخصوص فقیہانِ ہند کا ایک طبقہ کرنسی نوٹ کا نصاب زکوٰۃ حدیثِ نبوی میں وارد پانچ اواقی کی قیمت کے برابر متعین کرتا ہے کہ وہ فقیروں اور مسکینوں یعنی زکوٰۃ کے مستحقین کے لیے زیادہ نافع ہے کہ زیادہ سے زیادہ مالداروں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ حسنِ اتفاق یا سماجی مصالح کے اعتبار سے کمترین نصاب کو مثالی نمونہ یا اصولی قرار دینا تو صحیح ہو سکتا ہے مگر اس سے مکلف سے دفعِ ضرر اور اس کی جلبِ منفعت کی رعایت کا اصول متاثر ہوتا ہے۔ جبکہ حقیقت اور روحِ تشریع یہ ہے کہ مکلف فرد/ افراد/جماعت کے مصالح کی رعایت تشریع و تنفیذ قانون میں کی جانی چاہیے (مجلہ فقہ اسلامی، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نئی دہلی ۱۹۹۰ء دوسرے فقہی سمینار میں شامل مقالات بر کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت، ۱۸۱-۷۴؛ عتیق احمد بستوی، ۴۸۰؛ شمس پیرزادہ، ۶۰؛ حبیب الرحمٰن خیرآبادی ۹۳؛ ظفیرالدین مفتاحی ۱۰۹؛ زبیر احمد قاسمی، ۱۲۴؛ نسیم احمد قاسمی ۱۴۹، ۱۵۲؛ اختر امام عادل ۲۰۳)

چاندی کے کمترین نصاب زکوٰۃ پر نقد کے نصاب زکوٰۃ کو ان علماء و فقہاء کرام کے مطابق محمول کر کے متعین کرنا صحیح، معقول اور روحِ تشریع کے مطابق معلوم ہوتا ہے جو سونے کے نصاب کو بھی یا اس کی قیمت و مالیت کو بھی چاندی پر محمول کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک اصل ثمن صرف چاندی رہ جاتی ہے جس کا ذکر احادیث نبوی میں بالاتفاق ملتا ہے۔ لیکن جو فقہائے کرام جن میں فقہاء ہند بھی شامل ہیں سونے کا نصاب زکوٰۃ بیس مثقال کے وزن پر حدیثی اعتبار سے متعین تسلیم کرتے ہیں ان کے

نزدیک موجودہ شرحوں کے اعتبار سے سونے کا نصابِ زکوٰۃ چاندی کے نصاب سے حقیقی، واقعی اور متفاوت بن جاتا ہے اور ان کے اعتبار سے دو ثمن اصلی ہیں اور ان دونوں میں ایک اور سات کا مالی یا قیمتی تفاوت پایا جاتا ہے۔ (متعدد علماء ہند نے چاندی یا سونے میں سے کسی ایک کے نصاب تک کرنسی نوٹوں کے پہونچ جانے پر ان کا نصاب مقرر کیا ہے: مجلہ فقہ اسلامی میں مقالات مفتی عبیداللہ اسعدی، نظام الدین، عزیز الرحمٰن بجنوری، انیس الرحمٰن قاسمی؛ ابوالحسن علی، محمد زید وغیرہ ۹۵-۱۱۵)

دوسرے طبقۂ علماء و فقہاء کے نزدیک مالِ نقد — نوٹ، کرنسی — کا نصاب سونے کے بلند تر نصاب پر محمول کیا جائے گا۔ شاید اس لیے کہ موجودہ دور میں کرنسی سونے سے وابستہ، پیوستہ اور متعلق ہوتی ہے۔ اس میں مکلف کے مصالح کی رعایت ضرور ہے اور بعض دوسری مصالح بھی پائی جاتی ہیں لیکن بہرحال یہ بھی چاندی اور سونے کے نصابات کے مالی یا قیمت کے تفاوت کو دور نہیں کرتیں اور نصابِ زکوٰۃ کی یکساں قیمت یا ثمنیت کے اصول پر حرف لاتی ہیں۔ (مجلہ فقہ اسلامی، مذکورہ بالا میں مقالات علماء کرام: خالد سیف اللہ رحمانی ۸۰-۷۹؛ یوسف قرضاوی بحوالہ نسیم احمد قاسمی ۱۴۸)

اگر شاہ ولی اللہ دہلوی کی بیان کردہ حکمتِ نصاب، کہ ایک اوسط درجہ کے خاندان کی سال بھر کی کمترین اور لازمی ضروریات کی کفایت کرنے والا مال زائد ہو، صحیح ہے تو موجودہ دور میں تقریباً تمام ممالکِ اسلامی وغیر اسلامی میں چاندی کا نصابِ زکوٰۃ جو ہندوستانی پاکستانی سکہ میں چار ہزار روپے کے قریب آتا ہے۔ ایک معمولی خاندان کے ضروری سالانہ اخراجات کی کفایت نہیں کرسکتا۔ البتہ سونے کا نصابِ زکوٰۃ کسی حد تک کفایت کرسکتا ہے۔ ڈالر یا پونڈ وغیرہ غیر ملکی سکوں والے ممالک میں تو سونے کا نصاب بھی ایک سال کی ضروریاتِ لازمی کی کفایت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ چاندی کا نصاب ڈالر میں سو سے کم اور پونڈ میں پچاس سے کچھ اوپر ہوگا اور سونے کا نصاب ڈالر میں آٹھ سو کے قریب اور پونڈ میں ساڑھے چار سو کے قریب۔

اس سے زیادہ اہم اور تمام مصالح و مفاسد سے قطع نظر، ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نصاب کی متفاوت شرحیں مقصودِ شریعت، روحِ تشریع اور مقصدِ قانون کو پورا کرتے ہیں یا ان سے کم از کم ہم آہنگ ہیں؟ تمام احادیثِ نبوی، آثارِ صحابہ اور مسالکِ فقہاءِ اولین یہ ثابت کرتے ہیں کہ نصابِ زکوٰۃ میں یکساں ثمنیت اور متفقہ مالیت کا اصول

کارفرما تھا تاکہ مختلف اصنافِ مال کے مالکوں میں سے کسی بھی طبقہ پر غیر منصفانہ بوجھ نہ پڑے اور ایک کے مقابلے میں دوسرے پر زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔ یکساں ثمنیت و مالیت والے نصاب زکوٰۃ روحِ اسلامی کے مطابق بھی ہے اور اسلام کے سماجی انصاف کے اصول کے موافق بھی۔

موجودہ دور میں چاندی انسانی سماج میں اپنی اصلی قیمت کھو چکی ہے اور سونے کو ہر طرح سے مالِ رائج الوقت سمجھا جاتا ہے۔ تمام ملکوں کی کرنسی زیادہ تر سونے سے وابستہ ہے۔ کاروبار میں سونے کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ زیورات بالعموم سونے کے بنتے اور معیاری سمجھے جاتے ہیں۔ چاندی کے زیورات کمتر، بطور غیر ضروری آرائش یا بطور تفریح و تبدیلیٔ ذوق پہنے جاتے ہیں، یا غریب ترین طبقات میں ان کا رواج ہے۔ چاندی کے نصاب سے مالِ نقد کا نصاب وابستہ کرنے میں ان غربا و مساکین پر غیر ضروری بار پڑنے کا خطرہ ہے جن کے لیے زکوٰۃ کا نظام ہی مشروع و نافذ کیا گیا ہے۔

ان تمام مقاصد، مصالح اور فوائد کا تقاضا ہے اور ان سے زیادہ روحِ تشریع اسلامی کا کہ کرنسی کا نصاب سونے کے مقررہ نصاب — بیس مثقال — سے وابستہ کیا جائے۔ نیز چاندی اور سونے اور اجناس و مویشی کی قیمتوں میں جو مالیت کے لحاظ سے تفاوت آ گیا ہے اس کو صحیح اسلامی مقصود کے مطابق دور کر کے مختلف اموال کے نصابات میں مالیت کے اعتبار سے یکسانیت پیدا کی جائے۔ فقہاءِ اسلام سے یہ وقت کا تقاضا ہے اور اسلام کا مطالبہ بھی ہے۔

تعلیقات وحواشی

سلہ فقہِ اسلامی کا ایک مقصود یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ مضرت کو دور کرتی ہے اور منفعت لاتی ہے اور ایسا پورے مسلم معاشرہ اور انسانی سماج کے فلاح و بہبود کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس سے صرف ایک فرد یا مسلم ہی کی خیر خواہی مقصود نہیں ہوتی۔ بعض دوسرے فقہی مقاصد و اصول اسی فلاحِ عام کے مقصود کی جزوی، منفی یا مثبت ترجمانی کرتے ہیں، جیسے: لاضرر ولاضرار، یا الضرر یزال۔

سلہ۲ حدیثِ نبوی میں مذکور تمر (کھجور) فضہ/ورق (چاندی) اور ابل (اونٹ) کے نصاب کی حکمت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: اقول: انما قدر من الحب والتمر خمسة اوسق لأنها تكفى اقل اهل بيت الى سنة

وانما قدر من الورق خمس اواق لانہا مقدار یکفی اقل اھل بیت سنۃ کاملۃ اذا کانت الاسعار موافقۃ فی اکثر الاقطار واستقری عادات البلاد المعتدلۃ فی الرخص والغلاء تجد ذالک، وانما قدر من الابل خمس ذود.....

شاہ صاحب نے اونٹ کا نصاب زکوٰۃ بتانے کے بعد اس کے مطابق ایک بکری اس کی زکوٰۃ مقرر کرنے کی حکمت یہ بتائی ہے کہ اونٹ جثہ کے لحاظ سے سب سے بڑے جانوروں میں شمار ہوتا ہے لہٰذا اس کے قلیل ترین نصاب میں اس کا ایک حصہ نہیں دیا جا سکتا۔ اور نفع عام کی خاطر اور سہولت کی غرض سے ایک بکری زکوٰۃ مقرر کردی۔

ــ

۳ـہ حدیثِ مذکورہ بالا میں وارد زکوٰۃ کے تینوں نصاب کو چونکہ ایک سال کی کمترین ضروریات کی کفایت کرنے سے وابستہ کیا تو اس سے واضح ہوگیا کہ ان کی ثمنیت / مالیت قریب قریب ایک ہی تھی۔ عہدِ نبوی / تشریع میں ان تمام اصنافِ مال کی قیمتوں اور ان کے باہمی تبادلہ کی قیمتوں کا تقابلی مطالعہ بھی یہی ثابت کرتا ہے۔ اس پہلو پر مزید تحقیق و جستجو نئے دلائل و شواہد فراہم کرے گی۔ صدرِ اسلام میں قیمتوں کے ایک تحقیقی اقتصادی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو: منذر قحف، الاسعار بالنسبۃ فی المدینۃ المنورۃ فی العہدین النبوی والراشدی، مجلۃ بحوث الاقتصاد الاسلامی، مجلۃ الجمعیۃ الدولیۃ للاقتصاد الاسلامی، لیسٹر (یوکے) المجلد الاول العدد الاول ۱۹۹۱ء، ۴۴-۱۔

۴ـہ سونے کے نصاب زکوٰۃ کے بارے میں کتاب المغنی ۳/۶ میں حسب ذیل روایت ہے۔ لیس فی اقل من عشرین مثقالا من الذھب ولا فی اقل من مائتی درھم صدقۃ..... امام شافعی کا قول التلخیص الحبیر ص۱۸۲ کے حوالہ سے دیا گیا ہے۔ شاہ صاحب کا جملہ بھی بہت معنی خیز ہے: والذھب محمول علی الفضۃ وکان فی ذالک الزمان صرف دینار بعشرہ دراھم فصار نصابہ عشرین مثقالا، بعض کتب صحاح میں چاندی کے نصاب زکوٰۃ کے بارے میں احادیث اور ان کے ابواب متعلقہ ہیں مگر سونے کے نصاب پر نہ تو کوئی باب باندھا گیا ہے اور نہ حدیث نبوی لائی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو بالخصوص، کتاب الزکوٰۃ در صحیح بخاری و فتح الباری۔

۵ـہ اموال کی گرانی کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ گرانی اشیاء کی بہ نسبت کمتر فراہمی اور ضرورت کی زیادہ زیادتی کے سبب ہوتی ہے۔ قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اور فرق و تفاوت کے اقتصادی

اسباب کچھ بھی ہوں شریعت نے ان کا ہر حال میں لحاظ کیا ہے۔

۶ھ "عرف و عادت" کا فقہی قاعدہ صرف ان امور میں ملحوظ نہیں رکھا گیا جن کی بابت نصوص موجود نہ ہوں اور کتاب وسنت نے صریح رہنمائی نہ کی ہو" جیسا خالد سیف اللہ رحمانی اور ان کے ہمنوا فقہاء ہند کا خیال ہے (مجلہ فقہ اسلامی دوم ۱۲۴) بلکہ نصابات زکوٰۃ مقرر کرنے میں بھی ان کا لحاظ رکھا ہے۔ یعنی نصوص اسلامی میں بھی عرف وعادت کی رعایت ہمیشہ ملتی ہے۔

۷ھ غلاموں گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر نہ کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب نے لکھا ہے: ذالک لانہ لم تجر العادۃ باقتناء الرقیق للتناسل وکذا الخیل فی کثیر من الاقالیم لاتکثر کثرۃ یعتد بھا فی جنب الانعام....

۸ھ ان اصناف ال کی زکوٰۃ اور ان کے نصابات کا تقرر تمام کا تمام قیاس پر کیا گیا ہے جن کا ذکر حدیث نبوی میں نہیں ہے۔

۹ھ شاہ ولی اللہ دہلوی نے گیہوں کی شرح زکوٰۃ فطر کے بارے میں لکھا ہے:.... وحمل فی بعض الروایات نصف صاع من قمح من شعیر لانہ کان غالیاً فی ذالک الزمان لایاکلہ الا اصل التنعم، ولم یکن من یاکل المساکین، بینۃ زید بن ارقم فی قصۃ السرقۃ.

۱۰ھ یہ عجیب بات ہے کہ حضرت معاویہ کے قیاس کو اجماع کا درجہ مل گیا اور حدیث نبوی کی مانند غیر مبدل نصاب/شرح مان لیا گیا۔

۱۱ھ انفع للفقراء کا خیال کوئی اصول یا قاعدہ نہیں بلکہ بعض فقہاء کا مستنبط نتیجہ یا زاویۂ نگاہ ہے جو لازمی نہیں بن سکتا۔

۱۲ھ چاندی یا سونے میں کسی کے نصاب تک پہو نچ جانے پر فرضیت زکوٰۃ کا فتویٰ ضم نصاب نقدین میں تو صحیح ہوسکتا ہے لیکن کرنسی میں وہ لاطائل ہے کیونکہ چاندی کے فروتر نصاب سے ہم آہنگ ہونے کی صورت میں وہ سونے کے نصاب تک پہونچے گا ہی نہیں۔ گویا کہ نصاب سونا اس صورت میں ناممکن ہے۔

ترجمہ وتلخیص

احادیث اور اقوالِ ائمہ میں تعارض کے اسباب

علامہ ابن تیمیہؒ

مترجم: الطاف احمد مالانی عمری

قرآنی تصریح کے مطابق مسلمانوں پر لازم ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ اہل ایمان سے بھی محبت کریں بالخصوص علماء سے جو انبیاء کے وارث ہیں جن کی حیثیت بیابان کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی ہے اور جن کے صاحب علم وفضل اور ہدایت یافتہ ہونے پر امت کا اجماع ہے۔

پچھلی تمام امتوں میں ان کے علماء ہی ان کے بدترین افراد ہوا کرتے تھے جبکہ امت محمدیہ میں علماء اس کے بہترین افراد ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور آپ کی متروک سنتوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ ان کے ذریعہ قرآن مجید کا پیغام زندہ ہے اور ان کے توسط سے قرآن مجید سمجھا جاسکتا ہے اور وہ قرآن کی روشنی میں رہنمائی کرتے ہیں۔

اتباع رسول کی فرضیت پر علماء کا اتفاق ہے

جاننا چاہیے کہ امت مسلمہ میں مقبولیت کے مقام پر فائز ائمہ کرام میں سے کوئی بھی عمداً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ خواہ وہ سنت کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واجب ہے اور آپ کے علاوہ دیگر لوگوں کی باتیں قبول کی جاسکتی ہیں اور چھوڑی بھی جاسکتی ہیں لیکن آپ کے کسی ارشاد کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ترکِ حدیث کے اسباب

اگر کسی امام کا کوئی قول کسی صحیح حدیث کے خلاف ہو تو اس حدیث کو ترک کرنے کے لیے اس کے پاس ضرور کوئی نہ کوئی عذر ہوگا۔

ایسے تمام اعذار تین قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

پہلی قسم: یا تو اس کا خیال یہ ہوگا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے۔

دوسری قسم: یا وہ یہ سمجھتا ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہ حکم مستنبط نہیں ہوتا۔

تیسری قسم: یا وہ یہ سمجھتا ہوگا کہ یہ حکم منسوخ ہے۔

ان تینوں قسموں کے مختلف اسباب ہیں۔

پہلا سبب: حدیث کا نہ پہنچنا

ہو سکتا ہے کہ وہ حدیث اسے نہ ملی ہو اور جب حدیث ہی نہیں ملی تو اس کا حکم جاننے کا بھی وہ مکلف نہیں ہے اس صورت میں اس نے پیش نظر مسئلہ میں آیت کے ظاہری مفہوم، یا کسی دوسری حدیث یا قیاس[1] یا استصحاب[2] کی بنا پر جو بات کہی ہے وہ اس حدیث کے موافق بھی ہو سکتی ہے اور مخالف بھی۔

سلف کے بیشتر اقوال جو احادیث کے خلاف محسوس ہوئے ہیں ان کی بڑی وجہ عموماً یہی ہے اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حدیثوں سے واقفیت کسی بھی امام کے بس میں نہ تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی مجلس میں کچھ ارشاد فرماتے، یا کسی مسئلہ میں فتویٰ دیتے یا کوئی فیصلہ صادر فرماتے یا کوئی کام کرتے تو جو صحابہ اس وقت وہاں حاضر ہوتے وہ

---

[1] قیاس: کے لغوی معنی "اندازہ لگانے" کے ہیں اور ماہرین اصول فقہ کے ہاں اس کی مشہور تعریف یہ ہے "فرع پر اصل کا حکم لگانا ان دونوں (اصل اور فرع) کے درمیان موجود مشترک علت کی وجہ سے"

[2] استصحاب کی تعریف یہ ہے: "کسی چیز کو اپنی سابقہ حالت پر برقرار رکھنا تبدیلیٔ حالت یا حکم کے لیے دلیل کی عدم موجودگی کی وجہ سے"۔

اسے دیکھ اور سن کر دوسروں تک پہنچاتے اس طرح احادیث نبوی دیگر صحابہ وتابعین اور بعد کے لوگوں تک پہنچیں۔

پھر کسی دوسری مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اور ارشاد یا فتویٰ یا فیصلہ یا عمل صادر ہوتا اور اس مجلس میں بعض ایسے صحابہ حاضر ہوتے جو پہلی مجلس میں موجود نہیں تھے پھر یہ صحابہ اس چیز کو دوسروں تک پہنچاتے، اس طرح ان لوگوں کو بعض ایسی چیزیں معلوم ہوجاتیں جن سے دوسرے ناواقف ہوتے اور دوسروں کے پاس ایسا علم ہوتا جن سے یہ بے خبر ہوتے۔

یوں تو معلومات کی زیادتی اور صحت کے پہلو سے خود صحابہ میں اور ان کے بعد بھی علماء کے درمیان فرق رہا ہے، لیکن کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث سے باخبر ہے۔

اس کی بہترین مثال خلفاء راشدین ہیں جو پوری امت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امور آپ کی سنتوں اور آپ کے احوال سے سب سے زیادہ واقف تھے خصوصاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو اپنے بیشتر اوقات آپ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گذارتے تھے اور سفر وحضر میں کسی وقت بھی آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑتے تھے حتیٰ کہ رات میں بھی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر مسلمانوں کے مختلف معاملات میں غور وخوض کرتے تھے، تقریباً یہی حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے: "میں، ابوبکر اور عمر گئے" "میں، ابوبکر اور عمر نکلے"

لیکن اس کے باوجود جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ایک موقع پر ایک بوڑھی خاتون نے دادی کی میراث کے بارے میں پوچھا تو آپؓ نے فرمایا: اللہ کی کتاب میں تیرا کوئی حق نہیں بیان کیا گیا ہے اور مجھے علم نہیں کہ سنت رسول میں اس سلسلے میں کچھ مذکور رہو۔ لیکن میں لوگوں سے پوچھوں گا۔ جب انھوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما نے گواہی دی کہ آپؐ نے دادی کو چھٹا حصہ عطا فرمایا ہے[1] اور یہ حدیث حضرت عمران بن حصینؓ سے بھی مروی ہے[2]

[1،2] دیکھئے: ترمذی کتاب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الجدۃ، ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب فی الجدۃ۔

یہ تینوں صحابہ علم و فضل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے خلیفہ کے مرتبے کے نہ تھے لیکن اس سنت کا علم صرف انہی کو تھا ان کے سوا کسی کو نہ تھا

اسی طرح حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ استئذان (اجازت طلب کرنے[1]) کی سنت سے واقف نہ تھے یہاں تک کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے انھیں اس کی اطلاع دی اور انصار کو اس پر گواہ بنایا، حالانکہ عمر رضی اللہ عنہ اس سنت کو بیان کرنے والوں سے زیادہ ذی علم تھے[2]

اسی طرح حضرت عمرؓ اس بات سے واقف نہ تھے کہ عورت کو اپنے شوہر کی دیت میں سے حصہ (میراث) ملے گا بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ دیت صرف عاقلہ[3] کے لیے ہے۔ یہاں تک کہ حضرت ضحاک بن سفیان الکلامیؓ نے۔ جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند دیہاتوں کا امیر بنایا تھا۔ انھیں خبر دی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشیم الضبابیؓ کی بیوہ کو اس کے شوہر کی دیت میں سے میراث عطا فرمائی تھی[4]۔ تو حضرت عمرؓ نے اپنی سابقہ رائے بدل دی اور فرمایا: اگر میں یہ حدیث نہ سن لیتا تو میرا فیصلہ اس کے برخلاف ہوتا۔"

اسی طرح حضرت عمرؓ نہیں جانتے تھے کہ مجوس کے بارے میں جزیہ کا کیا حکم ہے؟ یہاں تک کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے انھیں بتایا کہ آپؐ کا ارشاد ہے "سنوا بهم سنة اهل الكتاب[5]" مجوس کے ساتھ اہل کتاب جیسا معاملہ کرو۔

۱؎ سنت استئذان یہ ہے کہ کوئی شخص جب کسی کے یہاں جائے تو تین مرتبہ سلام کرے (یا اجازت چاہے) اگر اجازت مل جائے تو بہتر ورنہ واپس لوٹ جائے۔

۲؎ دیکھئے: بخاری کتاب الاستئذان، باب التسلیم والاستئذان ثلاثا۔

۳؎ عاقلہ: قاتل کے ان رشتہ داروں کو کہا جاتا ہے جو اس کی طرف سے دیت (خونبہا) ادا کرتے ہیں۔ دیکھئے طلبۃ الطلبۃ للنسفی ص ۳۰۴ بحوالہ القاموس المحیط للفیروزآبادی۔ یہاں مراد یہ ہے کہ مقتول ہونے کی صورت میں وہی لوگ دیت کے مستحق بھی ہوں گے۔

۴؎ دیکھئے: ترمذی کتاب الدیات، باب ما جاء فی المراۃ ہل ترث من دیۃ زوجہا۔ ابوداؤد: کتاب الفرائض، باب فی المراۃ ترث من دیۃ زوجہا، ابن ماجہ: کتاب الدیات باب المیراث فی الدیۃ۔

۵؎ مسند شافعی، مسند بزار، مؤطا مالک، ابوداؤد کتاب الخراج والفئی والامارہ، باب=

جب حضرت عمرؓ مقام سرغ[۱] پہنچے اور وہاں آپ کو یہ اطلاع ملی کہ شام میں طاعون پھوٹ پڑا ہے تو آپ نے رفقاءِ سفر میں سے پہلے اولین مہاجرین سے پھر انصار سے پھر فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کرنے والوں سے مشورہ کیا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دی لیکن کسی نے اس سلسلے میں سنت رسول نہ بتائی، حتیٰ کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ تشریف لائے اور انھوں نے فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: إذا وقع بأرض وانتم بها، فلا تخرجوا فرارا منها، وإذا سمعتم به بأرض فلا تقدموا عليه[۲] اگر کسی جگہ طاعون پھوٹ پڑے اور تم وہاں ہو تو طاعون کے ڈر سے وہاں سے نہ نکل بھاگو، اور اگر تمہیں کسی جگہ طاعون پھیلنے کی خبر ملے تو وہاں نہ جاؤ۔"

اگر نمازی کو شک ہو جائے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں تو وہ کیا کرے؟ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے ایک دوسرے سے پوچھا لیکن ان میں سے کسی کو سنت معلوم نہ تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے انھیں آپؐ کا یہ فرمان سنایا" إنه ليطرح الشك ويبني على ما استيقن"[۳] کہ وہ شک کو چھوڑ دے اور جس تعداد پر یقین ہے اس پر اعتماد کرتے ہوئے نماز پوری کرلے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سفر میں تھے اچانک تیز ہوا چلنے لگی انھوں نے دریافت کیا "کون ہمیں ایسے وقت کی سنت بتائے گا؟" حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت یہ آواز مجھ تک پہنچی میں بہت پیچھے تھا۔ میں نے اپنی سواری تیز کی اور ان کے پاس پہنچ کر انھیں بتایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تیز ہوا چلتے وقت کیا حکم دیا ہے[۴]۔

= فی أخذ الجزیۃ من المجوس۔

[۱] شام اور حجاز کی سرحد پر مغتیہ اور تبوک کے درمیان ایک مقام کا نام

[۲] ملاحظہ ہو: بخاری۔ کتاب الطب، باب ما یذکر فی الطاعون، مسلم، کتاب الطب، باب الطاعون والطیرۃ والکہانۃ ونحوہا۔

[۳] دیکھئے مسلم کتاب المساجد، باب السہو فی الصلوٰۃ والسجود لہ، ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ باب اذا شک فی اثنتین والثلاث من قال یلقی الشک۔

[۴] دیکھئے: مسلم، کتاب صلاۃ الاستسقاء، باب التعوذ عند رؤیۃ الریح والغیم، والفرح بالمطر۔ ترمذی: کتاب الدعوات، باب ما یقول اذا ہاجت الریح، ابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب ما یدعو بہ الرجل اذا رأی السحاب والمطر

یہ چند مواقع ہیں جن کے بارے میں حضرت عمرؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت معلوم نہ تھی۔ اس کا علم انھیں اپنے سے کم رتبہ بعض صحابہ سے ہوا۔

کئی مواقع پر انھیں سنت کا علم نہ ہوسکا چنانچہ انھوں نے اپنی صوابدید پر فیصلہ یا فتویٰ صادر کردیا۔

مثلاً انگلیوں کی دیت کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ جس طرح ان کے منافع یکساں نہیں ہیں اسی طرح ان سب کی دیت بھی یکساں نہیں ہوگی حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم جن کا علمی مرتبہ ان سے کم تھا۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے باخبر تھے کہ: "یہ اور یہ یعنی انگوٹھا اور چھنگلیا آخری چھوٹی انگلی دونوں کی دیت برابر ہے۔"[1] اس سنت کا علم حضرت معاویہؓ کو اپنے دور خلافت میں ہوا تو انھوں نے اس کے مطابق فیصلہ کیا اور مسلمانوں نے اس فیصلے کو قبول کیا۔ اس حدیث کے خلاف فیصلہ کرنے کی وجہ سے حضرت عمرؓ پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ وہ اس سے واقف ہی نہ تھے۔

اسی طرح حضرت عمرؓ، آپ کے فرزند عبداللہؓ اور بہت سے اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم۔ مُحرِم کو احرام سے پہلے اور (۱۰ ذی الحجہ کو) جمرۃ العقبہ کی رمی کے بعد طوافِ افاضہ سے پہلے خوشبو استعمال کرنے سے روکتے تھے کیونکہ انھیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کا علم نہ تھا کہ: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے احرام کے لیے احرام سے پہلے اور عام حالات میں طوافِ افاضہ سے پہلے خوشبو لگائی ہے۔"[2]

اسی طرح حضرت عمرؓ اس بات کے قائل تھے کہ موزوں پر مسح بلا تحدید اس وقت تک کیا جاسکتا ہے جب تک کہ انھیں اتار نہ دیا جائے۔ سلف کی ایک جماعت بھی اس معاملے میں آپ کی ہم خیال تھی کیونکہ ان تک تحدید کی وہ احادیث

---

[1] بخاری: کتاب الدیات باب دیۃ الأصابع، ابوداؤد: کتاب الدیات، باب دیات الاعضاء۔
ترمذی: کتاب الدیات، باب دیات الاعضاء، نسائی: کتاب القسامۃ باب عقل الاصابع۔

[2] دیکھئے: بخاری: کتاب الحج، باب الطیب عند الاحرام وما یلبس اذا اراد ان یحرم ویترجل ویدھن

نہیں پہنچی تھیں جو ان سے کم علم صحابہ کے پاس موجود تھیں۔ تحدید کی یہ احادیث آپؐ سے متعدد صحیح اسناد سے مروی ہیں[۱]

اسی طرح حضرت عثمانؓ کو یہ معلوم نہ تھا کہ بیوہ اپنے شوہر کے گھر میں عدت گزارے گی یہاں تک کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی بہن فریعہ بنت مالکؓ نے اپنا واقعہ بتایا کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: "اپنے گھر ہی میں رہو یہاں تک کہ عدت مکمل ہو جائے۔"[۲] حضرت عثمانؓ نے ان کی روایت کو قبول کر لیا۔

ایک مرتبہ حالتِ احرام میں انھیں ایک ایسے جانور کا گوشت پیش کیا گیا جس کا شکار بطورِ خاص ان کے لیے کیا گیا تھا وہ اسے کھانے ہی والے تھے کہ حضرت علیؓ نے انھیں خبردار کیا کہ: ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت پیش کیا گیا تھا مگر آپؐ نے لوٹا دیا تھا۔"[۳]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست کوئی حدیث سنتا تو حسبِ توفیق اس سے فائدہ اٹھاتا تھا، لیکن جب کوئی دوسرا شخص مجھ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرتا تو میں اس سے قسم لیتا تھا۔ اگر وہ قسم کھا لیتا تھا تو میں اس کی بات کو سچ مان لیتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے بیان کیا ہے اور ابوبکرؓ سچے ہیں۔ پھر انھوں نے صلاۃ التوبہ کی مشہور حدیث بیان کی[۴]

---

[۱] ملاحظہ ہو: ترمذی، کتاب الطہارۃ، باب المسح علی الخفین، نسائی: کتاب الطہارۃ، باب التوقیت فی المسح علی الخفین للمسافر، ابن ماجہ: کتاب الفتن، باب طلوع الشمس من مغربہا۔

[۲] ملاحظہ ہو: ابوداؤد کتاب الطلاق، باب فی المتوفی عنہا تنتقل، ترمذی: کتاب الطلاق باب ماجاء این تعتد المتوفی عنہا زوجہا، نسائی: کتاب الطلاق: باب مقام المتوفی عنہا زوجہا فی بیتہا حتی تحل، ابن ماجہ: کتاب الطلاق، باب این تعتد المتوفی عنہا زوجہا،

[۳] دیکھئے ابن ماجہ کتاب المناسک، باب مانہی عنہ المحرم من الصید۔

[۴] دیکھئے: ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فی الاستغفار، ترمذی کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی الصلوٰۃ عند التوبہ؛ ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ باب ماجاء فی ان الصلوٰۃ کفارۃ

حضرت علی، حضرت ابن عباس اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے فتویٰ دیا کہ: "بیوہ اگر حاملہ ہو تو وضع حمل اور متوفی عنہا زوجہا کی عدت چار ماہ دس دن دونوں میں سے جو مدت زیادہ لمبی ہو وہ گذارے گی" انھیں حضرت سبیعۃ الاسلمیہ رضی اللہ عنہا کے سلسلے میں سنت نبوی کا علم نہ تھا۔ ان کے شوہر حضرت سعد بن خولہ کے انتقال پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا تھا کہ "ان کی عدت زچگی ہے"۔[1]

اسی طرح حضرت علی، حضرت زید اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے فتویٰ دیا کہ "مفوضہ[2] کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو وہ مہر کی حقدار نہ ہوگی"۔ کیونکہ انھیں حضرت بروع بنتِ واشق رضی اللہ عنہا کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کا علم نہ تھا۔[3]

یہ ایک وسیع موضوع ہے۔ صحابۂ کرام سے اس طرح کے واقعات بہت بڑی تعداد میں منقول ہیں۔ رہے بعد کے لوگ تو ان سے مروی اس طرح کے واقعات کا احاطہ ممکن نہیں۔ کیونکہ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

یہ حضرات امت میں سب سے زیادہ ذی علم، صاحب فہم، متقی اور افضل تھے۔ بعد کے لوگوں کا مرتبہ ان سے کم ہے۔ اس لیے ان کا بعض سنتوں سے ناواقف رہ جانا عین ممکن ہے۔

اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہر صحیح حدیث ہر امام تک یا کسی خاص امام تک ضرور پہنچ گئی تھی تو وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے۔

کسی کے ذہن میں یہ سوال نہ ابھرے کہ تمام احادیث جمع کر دی گئی تھیں پھر کیسے ان لوگوں تک نہیں پہنچیں؟ اس لیے کہ یہ کتابیں ائمہ فقہاء رحمہم اللہ کے انتقال کے بعد

---

[1] دیکھئے: بخاری: کتاب الطلاق، باب اُولات الاحمال اجلہن اَن یضعن حملہن۔ نسائی: کتاب الطلاق باب عدۃ الحامل المتوفی عنہا زوجہا، ابن ماجہ: کتاب الطلاق باب الحامل المتوفی عنہا زوجہا اذا وضعت حلت للأزواج۔

[2] جس عورت کا بغیر مہر کے نکاح ہو جائے۔

[3] ابوداؤد، کتاب النکاح باب فیمن تزوج ولم یسم صداقا حتی مات، ترمذی: کتاب النکاح باب ماجاء فی الرجل یتزوج المرأۃ فیموت عنہا قبل ان یفرض لہا، نسائی: کتاب الطلاق، باب اباحۃ التزویج بغیر صداق، ابن ماجۃ: کتاب الطلاق، باب الرجل یتزوج فلا یفرض لہا فیموت علی ذلک۔

مدوّن ہوئی ہیں۔ یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ ساری حدیثیں کتابوں میں جمع کر دی گئی ہیں بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ساری حدیثیں کتابوں میں جمع کر دی گئی ہیں تو ہر عالم کا ان سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے۔ بسا اوقات ایک شخص کے پاس بہت سی کتابیں ہوتی ہیں لیکن ان کے مشتملات سے وہ واقف نہیں ہوتا۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کا زمانہ کتب حدیث کی تدوین سے پہلے کا ہے وہ متاخرین سے زیادہ سنت سے باخبر تھے۔ اس لیے کہ بہت سی حدیثیں جو ان تک صحیح سند سے پہنچیں ہو سکتا ہے ہم تک بالکل نہ پہنچی ہوں یا کسی مجہول راوی یا منقطع سند سے پہنچی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ان حضرات کے سینوں میں کتابوں سے کئی گنا زیادہ علم پوشیدہ تھا۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ جو شخص تمام حدیثوں سے باخبر نہ ہو وہ مجتہد نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اگر مجتہد کے لیے احکام سے متعلق تمام قولی اور فعلی احادیث سے واقفیت کی شرط لگا دی جائے تو اس پر پوری امت میں ایک شخص بھی پورا نہیں اتر سکتا بلکہ عالم کے لیے بس اتنا ممکن ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ حدیثوں سے واقف ہو اور صرف چند حدیثیں ہی اس سے چھوٹیں اگرچہ ممکن ہے کہ یہ چند احادیث اس کے پاس موجود دیگر احادیث سے بعض معاملات میں مختلف ہوں۔

دوسرا سبب : حدیث کا ثابت نہ ہونا

ہو سکتا ہے کہ ایک حدیث اس تک پہنچی ہو لیکن اس کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو۔ کیونکہ اس سے وہ حدیث بیان کرنے والا راوی یا اس کا استاد یا سند کا دوسرا کوئی راوی اس امام کی نظر میں مجہول، متہم یا سئی الحفظ ہو یا اسے وہ حدیث، سند متصل کے بجائے منقطع سند سے پہنچی ہو یا اس حدیث کے الفاظ منضبط نہ ہوں۔ جبکہ یہی حدیث کسی دوسرے امام کو ثقہ راویوں کے ذریعہ متصل سند سے پہنچی ہو یا وہ اس مجہول راوی کے بارے میں جانتا ہو کہ وہ ثقہ ہے یا وہ حدیث اس امام سے ان مجروح راویوں کے علاوہ دیگر معتبر راویوں نے روایت کی ہو یا وہ حدیث اس منقطع سند کے علاوہ کسی دوسری سند سے متصل ہو یا بعض حفاظ

حدیث نے اس حدیث کے الفاظ کو یاد رکھا ہو یا اس روایت کے دیگر شواہد اور متابعات مل جائیں جن سے اس کی صحت بے غبار اور واضح ہو جائے۔

ایسا بہت ہوا ہے خصوصًا تابعین، تبع تابعین اور بعد کے مشہور ائمہ کے دور میں اس کا تناسب پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے کہ احادیث اس زمانے میں بہت عام اور مشہور ہو چکی تھیں، لیکن بہت سے علماء کو وہ ضعیف سندوں سے ملتیں جبکہ دوسروں کو صحیح سندوں سے پہنچتی تھیں اس لیے بعض کے نزدیک وہ حجت ہوتی تھیں اسی لیے بہت سے ائمہ سے ہمیں اس طرح کے اقوال ملتے ہیں کہ "اس مسئلہ میں میرا یہ فتویٰ ہے البتہ اس سلسلے میں فلاں حدیث مروی ہے اگر وہ صحیح ہے تو پھر میرا بھی وہی قول ہے"۔

تیسرا سبب: حدیث کو ضعیف سمجھنا

ترک حدیث کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند سے قطع نظر کوئی امام اپنے اجتہاد سے اسے ضعیف سمجھے جبکہ دوسرے امام کا اجتہاد اس سے مختلف ہو، اب چاہے اس مسئلہ میں دونوں میں سے کسی ایک کا اجتہاد صحیح مانا جائے یا دونوں کا جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ: "ہر مجتہد کا اجتہاد درست ہے۔

کسی حدیث کو ضعیف قرار دینے کے مختلف اسباب ہیں۔

۱۔ علم رجال بہت وسیع علم ہے دیگر علوم کی طرح اس میں بھی علماء کے درمیان بعض باتوں میں اجماع ہے اور بعض میں اختلافات رہے ہیں چنانچہ ممکن ہے کہ ایک حدیث کے کسی راوی کو ایک امام ضعیف قرار دیتا ہو جب کہ دوسرا اس کو ثقہ سمجھتا ہو اب یا تو اس کی رائے صحیح ہوگی جو اس کے راوی کو ضعیف قرار دے رہا ہے——اس لیے کہ وہ اس میں کسی ایسے سبب سے واقف ہے جو راوی کو ضعیف بنا دیتا ہے یا دوسرے امام کی رائے صحیح ہوگی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ عیب اس راوی میں قادح نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ عیب یا تو بذاتِ خود کسی کو ضعیف قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے یا اس راوی کے پاس کوئی ایسا عذر ہے جس کی وجہ سے وہ اس عیب کی بنا پر ضعیف نہیں قرار پاتا ہے۔

۲۔ ایک امام یہ سمجھتا ہو کہ راوی نے وہ حدیث اپنے استاد سے نہیں سنی ہے جبکہ دوسرے کا خیال ہو کہ اس نے اسے اپنے استاذ سے سنا ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جو معروف ہیں۔

۳۔ اس راوی کے دو مختلف حالات رہے ہوں۔ ایک حالت استقامت اور دوسری حالتِ اضطراب، مثلاً اس کی یادداشت میں کمی آجائے یا اس کی کتابیں جل جائیں۔ تو اس نے جو حدیثیں حالت استقامت میں بیان کی ہوں گی وہ صحیح ہوں گی اور جو حالتِ اضطراب میں بیان کی ہوں گی وہ ضعیف قرار پائیں گی۔ اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ ایک امام کو معلوم نہ ہو کہ یہ حدیث کس دور کی ہے؟ جبکہ دوسرے کو معلوم ہے کہ وہ حالتِ استقامت کی ہے۔

۴۔ محدث اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد بھول گیا ہو اور وہ بعد میں اسے یاد نہ آئے یا وہ انکار کرے کہ اس نے کبھی یہ حدیث بیان کی ہے۔ اس صورت میں ایک امام یہ سمجھتا ہے کہ ایسی حدیث قبول نہیں کی جائے گی جبکہ دوسرے کے نزدیک اس سے استدلال صحیح ہے اور یہ مسئلہ مشہور ہے۔

۵۔ بہت سے علمائے حجاز یہ سمجھتے تھے کہ اگر عراقی اور شامی حدیثوں کی اصل حجاز میں نہ ہو تو وہ قابلِ قبول نہ ہوگی۔ ان میں سے بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ: "اہل عراق کی حدیثوں کو اہل کتاب کی روایات کا مرتبہ دو، انھیں سچ تسلیم کرو نہ جھٹلاؤ۔

ایک دوسرے حجازی عالم سے پوچھا گیا: "کیا سفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ بن مسعود کی سند سے مروی روایت حجت ہے؟ انھوں نے جواب دیا: "اگر اس کی کوئی اصل حجاز میں نہیں تو حجت نہیں"۔

یہ اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اہل حجاز نے ساری حدیثیں جمع کر لیں ہیں اور کوئی حدیث ان سے نہیں چھوٹی ہے، اور اہلِ عراق کی حدیثوں میں اضطراب پایا جاتا ہے اس لیے ان کے سلسلے میں توقف کرنا ضروری ہے۔

بعض عراقی علما یہ سمجھتے تھے کہ شامیوں کی حدیثیں قابلِ حجت نہیں ہیں۔ لیکن اکثر ائمہ کے نزدیک اس وجہ سے کوئی حدیث ضعیف نہیں ہوگی۔ اگر کسی حدیث کی سند صحیح ہے پھر وہ حدیث حجت ہوگی خواہ اسے حجاز یا عراق یا شام یا کہیں کے

راویوں نے روایت کیا ہو۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے ان احادیث کو جمع کیا ہے جسے صرف ایک شہر والوں نے روایت کیا ہے۔ دوسرے شہر والوں سے وہ مروی نہیں ہیں جیسے مکہ، مدینہ، طائف، دمشق، حمص، کوفہ اور بصرہ وغیرہ۔

کسی حدیث کو ضعیف قرار دینے کے اس کے علاوہ دیگر اسباب بھی ہیں۔

چوتھا سبب: بعض خاص شرطیں لگانا

ترک حدیث کا ایک سبب یہ ہے کہ کوئی امام حافظ عادل راوی کی روایت میں بعض ایسی شرطیں لگائے جس سے دوسرے متفق نہ ہوں۔

مثلاً بعض ائمہ کرام کی یہ شرط کہ حدیث کو کتاب وسنت پر پرکھا جائے اور بعض کی یہ شرط کہ اگر حدیث متعین اصولوں سے متعارض ہے تو راوی کا فقیہ ہونا ضروری ہے اور بعض کی یہ شرط کہ اگر حدیث ایسے مسئلہ سے متعلق ہو جو عام طور پر پیش آتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ مشہور ہو اور بہت سے لوگ اس سے باخبر ہوں۔

یا اس جیسی دیگر شرطیں جو معروف ہیں۔

پانچواں سبب: حدیث کو بھول جانا

حدیث کسی امام کو ملی ہے اور اس کے نزدیک صحیح بھی ہے لیکن وہ اسے بھول گیا۔ نسیان کا خطرہ قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں میں ہے۔

مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مشہور واقعہ کہ ان سے پوچھا گیا اگر مسافر کو حالت سفر میں غسل کی حاجت پیش آجائے اور پانی نہ ملے تو کیا کرے؟ انھوں نے فرمایا: جب تک پانی نہ ملے وہ نماز نہیں پڑھے گا حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما بول پڑے "اے امیر المومنین کیا آپ کو یاد نہیں، جب ہم دونوں ایک مرتبہ سفر میں تھے اور جنبی ہو گئے تھے میں نے جانور کی طرح لوٹ پوٹ لگائی تھی اور اس طرح اپنے خیال میں تیمم کرکے نماز ادا کرلی تھی جبکہ آپ نماز سے رکے رہے پھر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہارے لیے ایسا کرنا کافی تھا" یہ کہہ کر آپ نے دونوں دست مبارک زمین پر مارے پھر ان سے اپنے چہرۂ انور اور دونوں ہتھیلیوں کا مسح فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: اے عمار، اللہ سے ڈرو (یعنی مجھے تو یاد نہیں) انھوں نے کہا اگر آپ فرمائیں تو میں یہ حدیث بیان نہ کروں حضرت عمرؓ نے فرمایا: نہیں بلکہ آپ اس کو بیان کیا کریں۔[1]

حضرت عمرؓ اس واقعہ کے عینی شاہد تھے لیکن وہ اسے بھول گئے، بلکہ اس کے خلاف فتویٰ بھی دیدیا تھا اور حضرت عمارؓ کی یاددہانی کے باوجود انھیں یاد نہیں آیا۔ لیکن انھوں نے حضرت عمارؓ کو جھٹلایا نہیں بلکہ فرمایا کہ اس حدیث کو بیان کیا کریں۔

اس سے بھی زیادہ صریح واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور فرمایا: "اگر کوئی شخص ازواج مطہرات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختران سے زیادہ مہر متعین کرے گا تو میں اس زیادتی کو ختم کردوں گا۔" اس پر ایک عورت نے کہا: "امیر المومنین، آپ ہمیں اس چیز سے کیوں محروم کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بخشی ہے پھر اس نے یہ آیت پڑھی: "وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا"[2] (... خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا)

اس پر حضرت عمرؓ نے اپنی بات واپس لے لی۔ یہ آیت انھیں معلوم تھی لیکن اس وقت وہ بھول گئے تھے۔

اسی طرح کی ایک روایت تاریخ میں آتی ہے کہ "حضرت علیؓ نے حضرت زبیرؓ کو جنگ جمل کے دن ایک ایسی بات یاد دلائی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے کہی تھی۔ حضرت زبیر کو وہ یاد آگئی اور وہ جنگ سے باز آگئے"[3]

۱؎ دیکھئے: بخاری، کتاب التیمم: باب التیمم ہل ینفخ فیہما، مسلم: کتاب الحیض، باب التیمم۔ ابوداؤد: کتاب الطہارۃ، باب التیمم، ترمذی: کتاب الطہارۃ، باب ماجاء فی التیمم، نسائی: کتاب الطہارۃ باب التیمم فی الحضر، ابن ماجۃ، کتاب الطہارۃ وسننہا، باب ماجاء فی التیمم ضربۃ واحدۃ۔

۲؎ سورہ النساء: ۲۰

۳؎ البدایۃ والنہایۃ: ابن کثیر: ۷/۲۴۰

متقدمین اور متاخرین علماء کے یہاں اس طرح کے بے شمار واقعات ملتے ہیں

چھٹا سبب: حدیث کا مفہوم نہ سمجھ پانا

ترک حدیث کا ایک اہم سبب حدیث کا مفہوم نہ سمجھ سکنا بھی ہے۔ ایسا کبھی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ حدیث میں وارد لفظ نیا اور مشکل ہوتا ہے۔ جیسے "المزابنۃ"[1] "المخابرۃ"[2] "المحاقلۃ"[3] "الملامسۃ"[4] "المنابذۃ"[5] اور "الغرر"[6] یا اس جیسے دیگر الفاظ جن کے مفہوم میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ اور جیسا کہ ایک مرفوع حدیث ہے " لا طلاق ولا عتاق فی اغلاق "[7] ("اغلاق" میں دی جانے والی طلاق اور آزادی صحیح نہیں ہے) اس میں لفظ "اغلاق" کا ترجمہ بعض نے اکراہ (زبردستی) کیا ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں ان کے نزدیک "اغلاق" کا یہ مفہوم نہیں ہے۔

کبھی اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ کسی امام کی زبان اور عرف میں ایک لفظ کا جو معنی ہوتا ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی زبان سے مختلف ہوتا ہے لیکن وہ یہ سمجھ کر کہ یہ مفہوم اب تک باقی ہے اسے اپنی زبان میں معروف معنی پر محمول کر لیتا ہے۔

مثلاً بعض علماء نے "نبیذ" کے بارے میں رخصت کی چند حدیثیں سنیں اور یہ سمجھ لیا کہ اس سے وہی نشہ آور چیزیں مراد ہیں جنھیں ان کے عرف میں نبیذ کہا جاتا

---

[1] المزابنۃ: درخت پر موجود گیلی کھجور کو خشک کھجور کے عوض بیچنا۔

[2] المخابرہ: کھیتی سے حاصل ہونے والے غلہ یا پھل کے ایک متعین حصہ جیسے چوتھائی یا تہائی کے بدلے کاشت کرنا۔

[3] المحاقلۃ: اس کی تفسیر میں اختلاف ہے: (۱) غلہ کی متعین مقدار جیسے ۱۰۰ من کے بدلے زمین کو کرایہ پر دینا۔ (۲) غلہ کی متعین مقدار جیسے چوتھائی، تہائی پر بٹائی کرنا، (۳) کھیتی کو پکنے سے پہلے فروخت کر دینا۔

[4] الملامسۃ: یہ کہنا کہ جب تم میرا کپڑا یا میں تمہارا کپڑا چھوؤں گا تو سودا طے ہو جائے گا۔ یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کا سودا اسے دیکھے بغیر محض چھو کر کیا جائے۔

[5] المنابذہ: ایک دوسرے کی چیز کو کنکری پھینک کر متعین کرنا اس طرح کہ اس کا لینا ضروری ہو۔

[6] ہر وہ سودا جس کے ظاہر سے خریدار دھوکا کھا جائے اور اس کی اندرونی حالت پوشیدہ رہے۔

[7] دیکھئے: ابوداؤد، کتاب الطلاق باب فی الطلاق علی غلط (علی غضب)

تھا حالانکہ حدیث میں نبیذ سے مراد وہ میٹھا شربت ہے جس میں کھجور وغیرہ ڈال کر چھوڑ لیا جاتا ہے اور نشہ پیدا ہونے سے پہلے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بہت سی صحیح احادیث میں اس کی یہ تشریح مذکور ہے۔

اسی طرح قرآن وسنت میں وارد لفظ "الخمر" سے انھوں نے صرف انگوری شراب سمجھی اس لیے کہ ان کے عرف میں "الخمر" کا اطلاق صرف اسی پر ہوتا تھا حالانکہ بہت سی صحیح حدیثوں میں بیان کیا گیا کہ "خمر" کا اطلاق ہر نشہ آور مشروب پر ہوتا ہے[1]۔

بعض اوقات حدیث کا مفہوم سمجھنے میں اس لیے دشواری ہوتی ہے کہ ایک ہی لفظ متعدد معانی کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے یا وہ مجمل (تفصیل طلب) ہوتا ہے یا اس کے دو معانی ہوتے ہیں ایک حقیقی اور دوسرا مجازی، اب وہ امام جس معنی کو زیادہ بہتر اور مناسب سمجھتا ہے اسے اختیار کر لیتا ہے حالانکہ وہاں دوسرا معنی مراد ہوتا ہے۔

مثلاً صحابہ کی ایک جماعت نے ابتدا میں آیات صیام میں "الخيط الابيض والخيط الاسود" کو حقیقی سفید اور سیاہ دھاگوں پر محمول کیا[2]۔

بعض صحابہ نے سمجھا کہ آیت تیمم "فامسحوا بوجوهكم وايديكم" میں "ايديكُم" سے پورا ہاتھ مراد ہے۔

بعض اوقات فہم حدیث میں اس لیے غلطی ہو جاتی ہے کیوں کہ اس عبارت کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ عربی میں دلالت کے بہت سے پہلو ہیں ان کا ادراک کرنے اور کلام کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں سب لوگ برابر نہیں ہوتے ان کے درمیان صلاحیتوں اور قابلیتوں کا کافی فرق ہوتا ہے۔

ایک شخص کلام کو اس کے عموم پر محمول کر کے سمجھ لیتا ہے لیکن اسے یہ احساس نہیں ہو پاتا کہ یہ معنی اس عموم میں داخل ہے اور کبھی اسے سمجھ تو لیتا ہے لیکن بعد میں

---

[1] دیکھئے: بخاری: کتاب الأشربۃ باب الخمر من العنب وغیرہ، مسلم: کتاب التفسیر، باب فی نزول تحریم الخمر، ابوداؤد کتاب الاشربۃ، باب فی تحریم الخمر، ترمذی: کتاب الاشربۃ: باب ما جاء فی الحبوب التی یتخذ منہا الخمر۔

[2] احمد، بخاری، مسلم۔

بھول جاتا ہے اور یہ بھی بہت وسیع باب ہے جس کا احاطہ اللہ کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔ بعض اوقات غلطی سے کسی عبارت سے کوئی ایسا معنی نکال لیتا ہے جس کی عربی زبان میں گنجائش نہیں ہوتی۔

ساتواں سبب: یہ سمجھ لینا کہ یہ حدیث اس مسئلہ کے لیے دلیل نہیں بن سکتی

گذشتہ سبب اور اس میں فرق یہ ہے کہ گذشتہ سبب میں امام وجہ استدلال ہی نہیں سمجھ پاتا جبکہ اس میں وہ وجہ استدلال تو سمجھتا ہے لیکن اس استدلال کو صحیح نہیں سمجھتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک کچھ اصول اس مفہوم سے ٹکراتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح ہے یا غلط۔

مثلاً یہ سمجھے کہ عام مخصوص (جس کی تخصیص ہوگئی ہو) حجت نہیں ہے یا یہ سمجھے کہ اس سے جو مفہوم سمجھ میں آرہا ہے وہ حجت نہیں ہے یا وہ عام حکم جس کا بیان کسی سبب کے ساتھ ہو وہ اسی کے ساتھ خاص ہوگا یا مجرد حکم وجوب پر دلالت نہیں کرتا یا اس کی فوری تعمیل ضروری نہیں یا یہ کہ کوئی لفظ الف لام کے ذریعہ معرفہ ہو تو اس میں عموم نہیں ہوتا یا منفی افعال سے ان کے ذوات کی نفی نہیں ہوتی اور نہ ان کے تمام افعال کی نفی ہوتی ہے یا یہ کہ مقتضی کے لیے کسی طرح کا عموم نہیں ہے چنانچہ ضمائر اور معانی میں عموم کا دعویٰ نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح کے دیگر اصول جن کا تذکرہ طوالت کا باعث ہوگا۔

اصول فقہ کے نصف سے زائد مختلف فیہ مسائل کا تعلق اسی قسم سے ہے اگرچہ اصول مجردہ میں پائے جانے والے تمام مختلف فیہ دلالتوں کا ابھی تک احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔

اسی میں دلالتوں کی جنس کے افراد بھی داخل ہوجاتے ہیں کہ آیا وہ اسی کی جنس سے ہیں یا نہیں؟

مثلاً کسی متعین لفظ کے متعلق امام یہ سمجھے کہ یہ مجمل (تفصیل طلب) ہے اس لیے کہ وہ متعدد معانی کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے اور وہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جو کسی ایک معنی کو متعین کرسکے وغیرہ۔

آٹھواں سبب: یہ سمجھنا کہ معارض دلیل سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا یہ مفہوم مراد نہیں ہے۔

ترک حدیث کا ایک اہم سبب امام کا یہ سمجھنا ہے کہ اس سے استدلال سے کوئی ایسی دلیل متعارض ہے جو اس معنی کے یہاں مقصود نہ ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ مثلاً عام اور خاص، مطلق اور مقید، امر مطلق اور منافی وجوب اور حقیقت و مجاز وغیرہ کے درمیان تعارض اور یہ بھی ایک وسیع باب ہے۔

اس لیے کہ مفاہیم کے درمیان تعارض اور ان کے مابین ترجیح ایک انتہائی پیچیدہ کام ہے جو وسیع علم اور طویل تجربہ کا متقاضی ہے۔

نواں سبب: ایک حدیث کو کسی دوسری حدیث سے متعارض سمجھنا

اس کا ایک اہم سبب امام کا یہ سمجھنا بھی ہے کہ اس حدیث سے کوئی ایسی چیز معارض ہے جو اس کے ضعیف، یا منسوخ، یا مؤول ہونے پر دلالت کر رہی ہے بشرطیکہ وہ حدیث قابل تاویل ہو اور وہ چیز معارض بننے کی اہلیت رکھتی ہو مثلاً آیت یا حدیث یا اجماع۔

اس کی دو قسمیں ہیں:

اول یہ کہ وہ سمجھے کہ معارض دلیل فی الجملہ راجح ہے اس صورت میں تین میں سے کوئی ایک بات ضرور ہو گی یعنی یا تو وہ ضعیف قرار پائے گی یا منسوخ یا قابل تاویل۔ ان میں سے کیا ہے یہ متعین نہیں ہوگا۔

کبھی مذکورہ تینوں صورتوں میں سے ایک صورت متعین ہو جائے گی مثلاً وہ سمجھے گا کہ یہ منسوخ یا قابل تاویل ہے اگرچہ اس کا امکان ہے کہ اسے منسوخ یا قابل تاویل سمجھنے میں وہ غلطی پر ہو یا وہ مؤخر کو مقدم سمجھ لے یا حدیث کی ایسی تاویل کرلے جس کی حدیث کے الفاظ میں گنجائش نہ ہو یا کوئی ایسی دلیل موجود ہو جو اس معنی کے مراد ہونے سے مانع ہے۔

اگر مجملاً کوئی حدیث اس حدیث سے معارض ہو تب بھی بعض اوقات وہ معارض حدیث دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ سند یا متن کے لحاظ سے وہ پہلی حدیث سے

فروتر ہوتی ہے۔ ایسی جگہ گذشتہ دیگر اسباب بھی پہلی حدیث میں آتے ہیں۔

عام طور پر جس اجماع کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس کی حقیقت بس اتنی ہوتی ہے کہ دعویٰ کرنے والے کو اس سے کسی کے اختلاف کا علم نہیں ہوتا۔

ہم نے متعدد ایسے علماء دیکھے ہیں جو بہت سی چیزوں کے محض اس وجہ سے قائل ہو گئے کہ ان کے پیش رووں نے بھی وہی کہا ہے اور اس کے خلاف کسی نے کچھ کہا ہو اس کا انھیں علم نہیں۔ حالانکہ دلائل کا ظاہری پہلو ان کے نزدیک اس کے مخالف حکم کا تقاضا کرتا تھا۔ لیکن عالم کے لیے ممکن نہیں کہ وہ کوئی ایسی بات کہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ کہی ہو حالانکہ وہ جانتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ اسی لیے بعض علماء احتیاطاً یوں کہتے تھے۔ "اگر اس مسئلہ میں اجماع ہے تو اسی کی پیروی زیادہ مناسب ہے ورنہ میری یہ رائے ہے۔"

اور جیسا کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ: "میں نہیں جانتا کہ کسی نے غلام کی گواہی کو جائز قرار دیا ہو۔" حالانکہ حضرت علیؓ، انسؓ اور شریحؒ وغیرہ سے اس کا جواز منقول ہے۔

ایسے ہی بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ: "علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ جو غلام پوری طرح آزاد نہیں ہوا وہ میراث نہیں پائے گا۔" حالانکہ حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ اسے وراثت کا مستحق قرار دیتے ہیں اور اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حسن حدیث بھی مروی ہے[1]

اسی طرح بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ "میں نہیں جانتا کہ کسی نے نماز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کو واجب کہا ہو۔" حالانکہ ابوجعفر الباقر اس کے قائل ہیں[2]

ایسا اس لیے ہوتا تھا کہ بہت سے اہل علم صرف ان علماء کے اقوال سے واقف ہوتے تھے جنھیں وہ اپنے شہر میں پاتے تھے، اور دیگر علماء کے اقوال سے

---

[1] ملاحظہ ہو: ابوداودؒ کتاب الدیات، باب فی دیۃ المکاتب۔ ترمذی: کتاب البیوع، باب ماجاء فی المکاتب اذا کان عندہ ما یؤدی۔ نسائی: کتاب القسامۃ باب دیۃ المکاتب

[2] اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے علامہ ابن القیم رحمہ اللہ کا رسالہ "جلاء الافہام فی الصلوۃ علی خیر الانام" ملاحظہ ہو۔

وہ ناواقف ہوتے تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ متقدمین میں سے بہت سے علماء صرف مدنی، یا کوفی علماء کے اقوال جانتے تھے اور بہت سے متاخرین صرف دو یا تین ایسے ائمہ کے اقوال جانتے تھے جن کی عام طور پر تقلید کی جاتی ہے اگر کوئی شخص ان سے ہٹ کر کوئی بات کہے تو وہ ان کے نزدیک اجماع کا مخالف قرار پاتا تھا اس لیے کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ کوئی اس کا قائل رہا ہے۔ حالانکہ برابر ان کے کانوں تک مخالف اقوال پہنچتے رہتے ہیں۔

اسی لیے وہ کوئی ایسی حدیث قبول نہیں کرتا جو حقیقۃً یا بزعم خویش اس کے نزدیک اجماع کے خلاف ہو کیونکہ اجماع ان کے نزدیک سب سے بڑی دلیل ہے۔

بہت سے علماء نے اسی عذر کی بنیاد پر بہت سی حدیثیں ترک کر دی ہیں ان میں سے بہت سے واقعۃً معذور رہیں جبکہ بہت سے دوسرے معذور بن گئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ معذور نہیں ہیں۔

بہت سے دیگر اسباب میں بھی یہی صورت حال ہے۔

دسواں سبب: کسی دوسری دلیل کا اس سے متعارض ہونا

ترک حدیث کا ایک اہم سبب امام کے نزدیک حدیث کا کسی ایسی دلیل سے متعارض ہونا ہے جو اس حدیث کے ضعیف یا منسوخ یا قابل تاویل ہونے پر دلالت کرے جبکہ دوسرے کے نزدیک یہ دلیل متعارض نہ ہو یا یہ کہ فی الواقع وہ کوئی راجح متعارض نہیں ہے۔

مثلاً بہت سے علماء کوفہ کے نزدیک صحیح حدیث کا ظاہر قرآن سے متعارض ہونا اور ان کا یہ سمجھنا کہ ظاہر قرآن جیسے عموم وغیرہ نص حدیث پر مقدم ہیں۔

بعض اوقات ایک شخص ایسی چیز کو ظاہر سمجھ لیتا ہے جو دراصل ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ دلالت کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے فقہاء کوفہ نے "الشاہد والیمین" (گواہ اور قسم) والی حدیث رد کر دی حالانکہ دوسرے علماء جانتے ہیں کہ قرآن کے ظاہری الفاظ میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جو گواہ اور قسم کے حکم سے مانع ہو اور اگر ایسا ہو تب بھی ان کے نزدیک حدیث قرآن کریم

کی تفسیر اور وضاحت کرتی ہے۔

اس قاعدہ کے سلسلے میں امام شافعی کی بحث مشہور ہے اور امام احمد بن حنبل کا بھی ایک مشہور رسالہ ان لوگوں کی تردید میں ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کا ظاہری مفہوم کافی ہے۔ اس کی تفسیر کے لیے حدیث کی ضرورت نہیں اس کے انھوں نے متعدد دلائل دیے ہیں۔ یہاں ان کا تذکرہ طوالت کا باعث ہوگا۔

اسی طرح بعض لوگ ایسی حدیث کو قبول نہیں کرتے جس میں قرآن کے عموم کی تخصیص یا اس کے مطلق کی تقیید، یا اس پر کوئی اضافہ ہو اور یہ سمجھتے ہیں کہ نص قرآنی پر اضافہ مثلاً اس کے مطلق کو مقید کرنا یا اس کے عام کو خاص کرنا نسخ کے مترادف ہے۔

اور جیسا کہ بہت سے فقہاء مدینہ کے نزدیک اگر صحیح حدیث عمل اہل مدینہ سے متعارض ہو تو وہ قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی صحیح حدیث کی مخالفت میں اہلِ مدینہ کا اجماع ہو تو ان کا اجماع حجت ہے اور اسے حدیث پر ترجیح دی جائے گی۔

چنانچہ اسی بنیاد پر انھوں نے "خیار مجلس" والی احادیث کی مخالفت کی اگرچہ اکثر علماء ثابت کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں خود فقہاء مدینہ کے درمیان اختلاف ہے اور اگر ان سب کا کسی مسئلہ میں اجماع ہوتا اور دوسرے ان کے مخالف ہوتے تب بھی حدیث ہی حجت ہوگی۔

نیز جیسے کہ کوفہ اور بصرہ کے علماء قیاس جلی کی بنیاد پر بعض احادیث کی مخالفت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایسی احادیث سے قواعد کلیہ نہیں توڑے جاسکتے ہیں۔ تعارض کی اسی طرح اور بھی بہت سی صورتیں ہیں، چاہے معارض صحیح ہو یا غلط۔

ترک حدیث کے یہ دس اسباب ہیں جو بہت واضح ہیں۔

ترکِ حدیث کے دیگر اسباب

بہت سی احادیث کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے مذکورہ اسباب کے علاوہ کسی دیگر سبب سے جسے ہم نہیں جانتے ہیں امام نے ان پر عمل نہ کیا ہو اس لیے کہ علم کے بہت سے مراتب ہیں اور علماء کے سینوں میں پوشیدہ تمام باتوں سے ہم واقف نہیں۔ عالم کبھی اپنی دلیل کا اظہار کر دیتا ہے اور کبھی نہیں کرتا اور اگر اظہار کر دیتا ہے تو کبھی وہ ہم تک پہنچتی -

ہے اور کبھی نہیں پہنچتی اور اگر ہم تک پہنچ جاتی ہے تب بھی کبھی ہم اس کی وجہ استدلال سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور کبھی آگاہ نہیں ہو پاتے خواہ وہ دلیل بذات خود صحیح ہو یا نہ ہو۔

غلطی کا احتمال شرعی دلائل کے مقابلے میں علماء کی آراء میں زیادہ ہے

ہم اگرچہ ان احتمالات کو ممکن سمجھتے ہیں لیکن ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی ایسے حکم کو جس کی دلیل صحیح حدیث سے ہم پر ظاہر ہو جائے اور اہل علم کی ایک جماعت اس کی تائید کرتی ہو اس کو چھوڑ کر کسی امام کا قول اختیار کریں خواہ وہ کتنا ہی بڑا صاحب علم کیوں نہ ہو۔ محض اس بنیاد پر کہ اس کے پاس اس دلیل کا کوئی نہ کوئی جواب ہوگا، اس لیے کہ کسی عالم کی رائے میں غلطی کا امکان شرعی دلائل میں غلطی کے امکان کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ شرعی دلائل اللہ کی طرف سے تمام انسانوں پر حجت ہیں جب کہ کسی عالم کی رائے کو یہ مقام حاصل نہیں۔

نیز دلیل شرعی سے اگر کوئی دوسری دلیل متعارض نہ ہو تو اس کے غلط ہونے کا امکان نہیں ہے جب کہ عالم کی رائے میں یہ بات نہیں ہے۔

اعلان ملکیت سہ ماہی تحقیقات اسلامی۔ فارم ۴۔ رول ۹

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔

۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر، پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔ قومیت: ہندوستانی

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ، یوپی۔

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ، یوپی

۶۔ ملکیت: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور۔ علی گڑھ، یوپی

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

(۱) مولانا محمد فاروق خاں (صدر) بازار چتلی قبر، دہلی ۶

(۲) ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی۔ فریدی ہاؤس، سرسید نگر علیگڑھ

(۳) جناب امین الحسن رضوی (رکن) ۶۴۰/۹۔ کاشانۂ رضوی۔ ذاکر نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

(۴) ڈاکٹر محمد رفعت، شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی

(۵) مولانا کوثر یزدانی ۱۳۵۲۔ بازار چتلی قبر۔ دہلی

(۶) ٹی۔ کے عبداللہ۔ مالاقن کنڈی ہاؤس، پلیری، کالی کٹ۔

(۷) ڈاکٹر حمید اللہ۔ مزمل منزل کمپلکس، علی گڑھ

(۸) ڈاکٹر احمد سجاد۔ طارق منزل۔ بریاتو ہاؤسنگ کالونی۔ رانچی

(۹) ڈاکٹر عبدالحق انصاری۔ 'الریحان' مزمل منزل۔ علی گڑھ

(۱۰) محمد جعفر۔ ابوالفضل انکلیو۔ نئی دہلی۔

(۱۱) سید جلال الدین عمری (سکریٹری)

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

مندرجہ معلومات میری علم و یقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر: سید جلال الدین عمری

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی

• سکریٹری ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی تصنیف "اسلام کی دعوت" دعوتِ اسلامی کی ضرورت واہمیت اور طریقۂ کار کے موضوع پر بنیادی کتابوں میں سے ہے۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن آچکے ہیں۔ مولانا ان دنوں اس پر نظرثانی کر رہے ہیں۔ اس کی جلد اشاعت متوقع ہے۔

• ادارہ کے منصوبہ کے تحت مولانا سلطان احمد اصلاحی نے "اسلام اور آزادیٔ فکروعمل"، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے "سیرتِ ابراہیم علیہ السلام۔ قرآن کی روشنی میں" اور مولانا محمد جرجیس کریمی نے "عقیدۂ توحید اور عدل کا قیام" کے موضوعات پر اپنے کام مکمل کر لیے ہیں۔ یہ کتابیں اشاعت کی منتظر ہیں۔ مولانا اصلاحی اب "اسلام۔ ایک نجات دہندہ تحریک"، ڈاکٹر ندوی "اسلام پر اعتراضات کا جائزہ (برصغیر کے تناظر میں) اور مولانا کریمی "مسلمانوں کی حقیقی تصویر۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں" کے موضوعات پر کام کر رہے ہیں۔

• "مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ" مولانا جلال الدین عمری کی مقبول کتابوں میں سے ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ The Rights of Muslim Woman-An Appraisal کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ہندی ترجمہ بھی قریب التکمیل ہے۔

• مولانا عمری کی کتاب "اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور" کا انگریزی اور تامل ترجمہ منظرعام پر آچکا ہے۔ اب اس کا ہندی ترجمہ اسلامی ساہتیہ پرکاشن دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کی تعارفی تقریب ۲۸ نومبر ۹۹ء کو مرکز جماعت اسلامی ہند نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔

• "معروف ومنکر" مولانا عمری کی ایک بہت اہم اور معروف تصنیف ہے۔ موضوع کی اہمیت اور مباحث کی انفرادیت کی بنا پر اسے بہت پذیرائی ملی ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی، عربی، ترکی، ہندی، تامل اور بنگلہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کا نیا اردو ایڈیشن مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔

• ادارہ میں توسیعی خطبات کے تحت ۲۸ نومبر ۹۹ء کو ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی ریڈر شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے "مسئلہ ربا اور اس کے متعلقات (مولانا اقبال سہیل مرحوم کی کتاب ربا کیا ہے؟ کے حوالہ سے) کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے مصنف کا

مختصر تعارف کراتے ہوئے کتاب کو موضوعِ بحث بنایا اور اس کے مشتملات کا تنقیدی جائزہ لیا۔ بعد میں سامعین نے مباحثہ میں حصہ لیا۔ آخر میں صدرِ مذاکرہ پروفیسر فضل الرحمٰن فریدی نے اسلام کے نظامِ معاشیات کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔

● انڈین ایسوسی ایشن فار اسلامک اکنامکس، علی گڑھ زکوٰۃ فنڈ اور یوپی رابطہ کمیٹی کے تعاون سے "زکوٰۃ کے معاشی پہلو" پر ۱۳-۱۴ر نومبر ۹۹ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دوروزہ کل ہند سمینار منعقد ہوا جس میں ملک کے متعدد علماء کرام اور دانشوروں نے شرکت کی۔ اس میں ادارہ سے مولانا سلطان احمد اصلاحی اور ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی شریک ہوئے۔ مولانا اصلاحی نے "ہندوستان میں تنظیمِ زکوٰۃ کے چند مسائل" اور ڈاکٹر ندوی نے "جماعت اسلامی ہند کا اجتماعی نظامِ زکوٰۃ۔ ایک تعارف" کے موضوع پر اپنے مقالات پیش کیے۔ مولانا اصلاحی نے سمینار کے ایک اجلاس کی صدارت بھی فرمائی۔

● ۷ر نومبر ۹۹ء کو جماعت اسلامی ہند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایریا کا دعوتی و تربیتی اجتماع منعقد ہوا۔ اس میں ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے مولانا سلطان اصلاحی کی نئی کتاب "اسلام اور آزادیٔ فکر و نظر" کا تعارف اور مباحث کا خلاصہ پیش کیا۔ بعد میں حاضرین کے بعض اشکالات اور سوالات کا خود مولانا اصلاحی نے جواب دیا۔

● ادارہ کے رفیق مولانا محمد جرجیس کریمی نے کئی سال قبل ادارہ کے شعبۂ تصنیفی تربیت سے وابستگی کے دوران "قرآن اور مستشرقین" کے عنوان سے ایک مقالہ تیار کیا تھا۔ اب یہ کتابی صورت میں ادارۂ خدمتِ خلق ڈھاباکیند، دمکا (بہار) سے شائع ہوگیا ہے۔ صفحات: ۱۰۲۔ قیمت: ۳۰ روپے۔ یہ کتاب مکتبۂ تحقیق سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

● ادارہ کی فوری ضروریات میں اس کی نامکمل عمارت کی تکمیل، پانی کی سپلائی اور لائبریری میں ضروری فرنیچر کی فراہمی ہے۔ ادارہ کے ہمدردان و بہی خواہان کی اس طرف توجہ سے یہ ضروریات بآسانی پوری ہوسکتی ہیں۔